سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

مبادیِ عمرانیات

تصنیف

رینے ورم

ترجمہ

ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب ڈی لٹ (پیرس)
پروفیسر تاریخ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۲ھ سنہ ۱۳۴۲ف سنہ ۱۹۳۳ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

مبادی عمرانیات (رینے ورم)

حصۂ اوّل

(صفحات ۱ تا ۲۷)

حصۂ دوم

(صفحات ۲۸ تا ۱۳۶)

حصۂ سوم

(صفحات ۱۳۷ تا ۱۶۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصّہ اوّل

پہلا باب

عمرانیات سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ ہر علم کے پیش نظر کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض حالتوں میں ایسا ہو کہ کسی خاص علم کی حدود مقرر کرنے میں ہمیں تامل ہو، مگر بہر صورت ہم اس مقصد سے واقف ہوتے ہیں جس کی جانب اس علم کی تحقیقی کوشش ہماری رہنمائی کرنا چاہتی ہے۔ دراصل علوم کے نام بجائے خود ان کی تعریف کا حکم رکھتے ہیں اس لئے کہ انھیں قبول عام کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ان ناموں سے لوگ وہی مراد لیتے ہیں جو ان علوم کا موضوع ہوتا ہے۔

مگر عمرانیات کا معاملہ اور دوسرے علوم سے ذرا مختلف ہے۔ خود لفظ عمرانیات سے جو تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نسبت اختلاف ہے۔ اس لفظ کی ایسی ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جن سے اس کے متضاد معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں کو تو اس میں شبہ ہے کہ آیا لفظ عمرانیات اس ساری علمی تحقیق پر حاوی بھی ہو سکتا ہے یا نہیں جو آج اس کے ماتحت خیال کی جاتی ہے۔ ہمیں اس کا پتہ لگانا چاہئے کہ یہ عدم تیقن اور شبہات کیونکر پیدا ہوئے؟

باب ۱

کیا اس باب میں ہم لفظ "عمرانیات" کو تصور وار ٹھہرائیں جو نیا نیا رائج کیا گیا؟ اس لفظ کے رواج پانے کی اصلیت یہ ہے کہ پہلے پہل آگست کونت نے ۱۸۴۲ء میں اپنی کتاب "فلسفۂ ایجابی کے اسباق" کی چوتھی جلد میں اس لفظ کو استعمال کیا۔ اس کتاب میں وہ لفظ "عمرانیات" کو اسی معنی میں استعمال کرتا ہے جس معنی میں وہ پہلے "عمرانی طبیعیات" کی اصطلاح استعمال کیا کرتا تھا۔ کونت کے زمانہ سے اب تک اتنا کافی عرصہ گزر چکا ہے کہ اس مدت میں لفظ "عمرانیات" کا مفہوم متعین ہو جانا چاہیے تھا۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم متعین نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ لفظ ہی خود عجیب سا ہے۔ کوئی چالیس سال ہونے آئے بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس لفظ کی بناوٹ دوغلی قسم کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لفظوں کی دوغلی قسم کی بناوٹ ناقص ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ لفظ "سوشیالوجی" کی اصل لاطینی ہے اور اس کا لاحقہ یونانی زبان کا ہے۔ شروع شروع میں اسی وجہ سے اس لفظ کو ہمیشہ واوین کے درمیان لکھا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی متروک یا غیر زبان کے لفظ کو لکھتے ہیں۔ کثرت استعمال سے آج اس لفظ کے ساتھ اس قسم کا ذلت آمیز سلوک نہیں کیا جاتا اور روزمرہ میں بھی بلا تکلف بولا جاتا ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چاہے بعض لوگ عمرانیات کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف رکھتے ہوں مگر یہ کہ "عمرانیات" کی اصطلاح کو سبھوں نے قبول کر لیا ہے۔

ہم نے جو ابھی ابھی کہا تھا کہ اب تک عمرانیات کا مفہوم متعین کرنے میں لوگوں کو تامل رہا ہے اس کے دراصل متعدد اسباب ہیں۔ پہلے سبب کی ذمہ داری خود علمائے عمرانیات کی طرف منسوب کرنی چاہیے۔ انھیں لازم تھا کہ شروع ہی میں اس لفظ کے معنی متفقہ طور پر مقرر کر لیتے۔ انھوں نے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بالکل برعکس ان میں سے ہر کوئی بس یہ چاہتا تھا کہ اپنی ذاتی رائے کو دوسروں سے منوائے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور ہر ایک نے یہ کوشش

کی کہ اس کی راہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں دونوں کی راہ سے الگ رہے۔ بہت سوں نے عمرانیات کا بالکل جدید تصور پیش کرنے کا دعویٰ کیا اور اپنی اُپَج سے اس کی نئی تعریف گھڑی۔ چنانچہ اس امر پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ لوگ جو علمِ عمرانیات سے ایک حد تک بے بہرہ تھے یا یہ کہ انھوں نے خاص طور پر اس کی تحقیق نہیں کی تھی، وہ سب کے سب یہ حال دیکھکر ہکا بکا رہ گئے۔ وہ اس علم کے مختلف نظاموں سے گھبرا اٹھے اور انھیں ان کی بحثوں سے الجھن پیدا ہونے لگی۔ اس کی ساری ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے عمرانیات کے جدید نظام پیش کیے۔

اس پریشاں خیالی کے اسباب کی تحقیق کے وقت ہمیں ایک اور عنصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کا تعلق عمرانیات سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ ان علوم سے ہے جو اس کے ساتھ قرابت رکھتے ہیں۔ جس زمانہ میں عمرانیات کی اصطلاح نئی نئی بنائی گئی تھی اس سے کہیں پہلے متعدد محقق اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین کر چکے تھے۔ معاشیات، اخلاق، قانون، اور سیاست کے علوم وجود میں آچکے تھے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شروع شروع میں ان علوم نے عمرانیات کو جس کی حیثیت نو وارد کی سی تھی، اپنی مجلس میں بے جا دخل اندازی کرنے والے سے تعبیر کیا ہوگا۔ اور غالباً اس کے ساتھ عمرانیات نے بھی ان پرانے علوم کو کھلم کھلا برا بھلا کہا ہوگا اور اپنی بے جا حقارت کے اظہار میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی چنانچہ اس ضمن میں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان علوم کے ماہروں اور علمائے عمرانیات میں جو نظری بحثیں ہوئیں ان سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ آپس کی بدمزگیاں بڑھ گئیں مگر مسائل کی پیچیدگی جیسی تھی ویسی ہی رہی بجائے اس کے کہ دوسرے علوم کے ماہر عمرانیات کے دائرۂ بحث کو محدود کرتے جس کے اندر رہ کر وہ اپنی تحقیق کرتی۔ انھوں نے اس کے نفسِ وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس بات کے مدعی ہوئے کہ عمرانیات کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ

باب

اس قسم کا دعویٰ وہی کرسکتا ہے جو اپنی رائے اور خیال میں مبالغہ کو راہ دینے کے لئے تیار ہو۔

ہمارے خیال میں ان علوم اور عمرانیات کے مابین مفاہمت ہونا کوئی دشوار بات نہ تھی۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ آگست کونت کے وقت میں معاشیات، اخلاق، قانون اور خاص کر کے علم سیاست کے پیش نظر یہ مقصد نہ تھا کہ وہ عالم اجتماعی کی تحقیق کرے بلکہ وہ تو اس کی رہبری کا دعویدار تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چلکر بتائیں گے اس وقت تک ان علوم کی حیثیت محض فنون کی تھی۔ علم میں اور فن میں جو فرق ہے۔ اسے دوسری جگہ واضح کیا جائے گا۔ اگر اس وقت ان علوم اور عمرانیات کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتا تو اس سے وہ بنیادی غلط فہمی رفع ہو جاتی جو بدستور آج تک چلی آرہی ہے۔ بہت بعد میں کہیں جاکر اسے بہت عرصہ نہیں ہوا کہ اجتماعی فنون کے مقابلہ میں اجتماعی علوم وجود میں آئے اور یہ سارے علوم دراصل تاریخ اجتماعی کے حصے ہیں جیسے تاریخ معاشی، تاریخ رسوم (جسے علم رسوم کا نام دیا گیا تھا)، تاریخ قانون اور تاریخ ادارات سیاسی۔ ان علوم کا عمرانیات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ان کا رشتہ اتنے قریب کا ہے کہ ممکن ہے کہ محض اس قرابت کی وجہ سے انہیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رقابت پیدا ہو اور ہر ایک یہ کوشش کرے کہ دوسروں کو اپنے میں ضم کرلے مگر اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح یہ علوم اپنے آپ کو عمرانیات کا قرابت دار خیال کرتے ہیں اسی طرح عمرانیات بھی انھیں اپنوں میں سمجھتی ہے۔ تو اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی آپس کی تو تو میں میں کی وہی حیثیت ہے جو خاندانی جھگڑوں کی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات کے مقصد کے متعلق جو شبہات پیدا ہوئے وہ دراصل اسی آپس کی بحث و تمحیص سے پیدا ہوئے۔ حالانکہ اگر اس بحث کو ٹھیک طریقہ پر کیا جاتا تو اصول عمرانیات کو بیّن طور پر پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں مل سکتا تھا۔

بہرحال اس میں قصور چاہے علمائے عمرانیات کا ہو، یا قدیم فنون اجتماعی کے ماہروں کا، یا جدید علوم اجتماعی کے حامیوں کا، ہمیں اس کا اعتراف کرنے میں مطلق پس وپیش نہیں کہ عمرانیات کا اصلی مفہوم ہنوز محتاج تشریح ہے۔ عمرانیات کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو شبہات ہیں وہ محض اس کے موضوع بحث کی تفصیلات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس کے بنیادی اصول، اس کی تعریف، اور یہاں تک کہ اس کے نفس وجود پر بھی حاوی ہیں۔ بلاشبہ عمرانیات کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ بہت جلد ان سب غلط فہمیوں کو رفع کرے۔

ایسا کرنا خود اس کے اپنے لئے مفید ہوگا۔ اور اس کے متعلق جو ہر طرف توقعات قایم کی گئی ہیں انھیں ایک حد تک پورا کرنے سے پیشتر اسے چاہیئے کہ وہ ان تمام مسائل کا حل دریافت کرے جن کی نسبت ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، بعضوں نے عمرانیات سے یہ توقع قایم کر رکھی تھی کہ اس کے ذریعہ سے انسانی معاشرتوں کو نئی زندگی ملے گی، بعضوں کا اعتقاد تھا کہ عمرانیاتی طریقۂ تحقیق سے گویا علوم وفلسفہ کی دنیا میں کایا پلٹ ہو جائے گی۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان توقعات کے قایم کرنے میں انتہائی غلو برتا گیا ہے۔ آگے چلکر ہم اس کی اچھی طرح تصریح کریں گے لیکن ساتھ ہی اس کے ہم اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عمرانیات میں اس کی صلاحیت ضرور موجود ہے کہ وہ انسانوں کے اجتماعی اعمال پر اپنا اثر ڈال سکے نیز انسانی علم میں قابل قدر اضافہ پیش کرے۔ بلاشبہ عمرانیات میں آپ کو ایسے مختلف تصورات ملیں گے جن میں آیندہ نشو ونما پانے کی پوری استعداد موجود ہے۔ اگر عمرانیات سے کوئی مفید کام لینا ہے تو ضرور ہے کہ خود اس کے اصلی تصور کا صحت وصفائی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ دراصل ہے کیا، اور اس میں آیندہ کیا ہونے کی قابلیت موجود ہے؟ ہم اپنی بحث میں اسی نقطۂ تحقیق کو اپنے خیالات کا مرکز قرار دیں گے۔

دوسرا باب

عمرانیات کو فن نہیں کہہ سکتے! عمرانیات کی تحقیق کا مقصد متعین کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم ایک غلط فہمی دور کردیں جو اس کی نسبت عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عمرانیاتی تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی اداروں کی اصلاح اور معاشرہ کی جدید تنظیم کے طریقے دریافت کئے جائیں بہت سارے لوگ سمجھتے ہیں کہ عالم عمرانیات وہی شخص ہوسکتا ہے جو اشتراکیت کے اصول پر عمل کرتا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو "عمرانیات" اور "معیشت اجتماعی" مترادف قرار پائیں گے۔

ہمیں اس بات پر بہت افسوس نہیں کرنا چاہئے کہ دراصل شروع میں یہ غلط فہمی عام بول چال کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ عام بول چال ہی کی بدولت لفظ عمرانیات ایسا مقبول ہوا کہ اس سے لوگوں کو ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہوگیا۔ آج عام طور پر جو یہ لفظ اس قدر مروج ہوگیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ عمرانیات کو لوگوں نے اس نیک شگون اور بخت آور پری سے تعبیر کیا جو اپنے ایک اشارے سے غریب انسانیت کے سارے دکھوں کو دور کردے گی۔ اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ آج لفظ عمرانیات ہر کس و ناکس کی زبان پر نہ ہوتا اگر لوگ اس کو محض ایک قسم کی علمی یا فلسفیانہ

باب ۲

تحقیق سمجھتے ۔

اور یاں ہمہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ عمرانیات کے مستند ماہروں نے اس کو ہمیشہ علمی اور فلسفیانہ تحقیق ہی سے تعبیر کیا ہے ۔ فرانس کا مشہور مفکر آگست کونت جس نے دراصل اس علم کی بنا ڈالی ، اپنی کتاب "فلسفۂ ایجابی کے اسباق" کے دوسرے باب میں اس بات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ ہمیں علوم اور ان کی عملی صورتوں میں فرق کرنا چاہئے۔ اس نے عمرانیات کو علوم کی صف میں سب سے آگے جگہ دی ہے ۔ اسی کتاب کی چوتھی ، پانچویں اور چھٹی جلدوں میں اس نے عمرانیات کے تاریخی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے ۔ محض اس کتاب کی تکمیل کی خاطر آگست کونت نے اجتماعی تنظیم کے عملی منصوبوں کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کردیا تھا۔[1]

آگست کونت کے بعد جس شخص نے عمرانیات کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے وہ ہربرٹ اسپنسر ہے۔ اس باب میں وہ بھی آگست کونت کا ہم خیال ہے ۔ ہربرٹ اسپنسر کے نزدیک عمرانیات اس علمی تحقیق کا نام ہے جس کے مطابق انسانی معاشرے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں اور ان کی فطری نظم و ترتیب عمل میں آتی ہے ۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "تشریحی عمرانیات" اور "اصول عمرانیات" میں یہی کیا ہے کہ

---

[1] ۔ بعد میں پھر جب آگست کونت کو اجتماعی تنظیم کا خیال پیدا ہوا تو اس نے اپنی وہ کتاب لکھی جو دو ناموں سے مشہور ہے "نظام سیاست ایجابی" یا "بیاض عمرانیات" جس میں مذہب انسانیت کے اصول مدون کئے گئے ہیں اس کتاب میں اس نے عمرانیات، سیاسیات، اور مذہب تینوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کے مشہور شاگرد امیل لترے اور جان اسٹورٹ مل دونوں نے کونت کے ان خیالات کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے قطع تعلق کرنے کے بعد اپنی تحقیق دوسرے اصول پر مبنی ٹھہرائی اس لئے کہ کونت نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں معروضی طریقۂ تحقیق کے بجائے موضوعی طریقہ سے اپنے نتائج نکالے ہیں ۔

باب ۲

اسی نقطۂ نظر سے سب واقعات کا انتخاب کیا ہے، انھیں ترتیب دی ہے اور ان کے فطری اعمال کو عام قوانین کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں عمرانیات کے عملی پہلو کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

بعد میں آنے والے علمائے عمرانیات نے ان دونوں کی تقلید کی۔ چنانچہ فرانس میں الفرد فوئے، گبریل تارو، الفرد اسپیناس اور امیل درکیم سب ہم خیال ہیں کہ عمرانیات ایک علمی یا فلسفیانہ نوعیت کی تحقیق ہے اسے عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسی طرح بلجیم میں گیوم دے گریف نے، روس میں یوجین دے روبرتی نے، آسٹریا میں لڈوگ گمپلووچز نے اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ جرمنی میں بھی جہاں عمرانیات کی تحقیق کی طرف ابھی حال ہی میں توجہ کی گئی ہے، پروفیسر فرڈیننڈ ٹونیس اور جارج سمل کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنی تحقیق میں مذکورۂ بالا خصوصیت کو بدستور باقی رکھا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جرمنی کی انجمن عمرانیات کا پہلا سالانہ اجلاس فرانکفورٹ (دریائے مین پر) میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تقریر کرنے والوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ صرف واقعات وحقایق پیش کریں اور اس بحث میں اپنی ذاتی رائے کو مطلق نہ داخل کریں۔ اس اجلاس کی تقریظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختلف صحبتوں میں جو مضامین پڑھے گئے ان میں سے ان سب حصوں کو صدر جلسہ نے علیحدہ کرا دیا جن میں غیر دانستہ طور پر مضمون نگاروں نے اپنے فیصلۂ اقدار کو شامل کر دیا تھا[۱]۔

یہ سچ ہے کہ ممالک متحدۂ امریکہ میں "عمرانیات" کی اصطلاح بہت عرصہ تک علمی اور عملی دونوں مفہوموں پر حاوی تھی اور یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست خیال کئے جاتے تھے[۲] مگر بایں ہمہ امریکہ

[۱] ۔ ملاحظہ ہو روبرشل کا مضمون "جرمنی کی انجمن عمرانیات اور اس کا پہلا اجلاس" جو سنہ ۱۹۱۰ء میں "بین الاقوامی مجلۂ عمرانیات" میں شایع ہوا۔

[۲] ۔ ملاحظہ ہو البین اسمال کا مضمون "ممالک متحدۂ امریکہ میں (بقیۂ حاشیہ برصفحۂ آیندہ)

باب ب

میں بھی جلیل القدر فضلائے عمرانیات کی تحقیق میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ وہ عمرانیات کی علمی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ لسٹر ایف وارڈ نے "عملی عمرانیات" کی تصنیف سے بہت قبل "خالص عمرانیات" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کو انھوں نے ہمیشہ زیادہ وقیع خیال کیا۔ اسی طرح ایچ گڈنگز کی "اصول عمرانیات" فی الحقیقت ایک خالص علمی کتاب ہے۔ حال میں امریکی یونیورسٹیوں کے جو دستور عمل شایع ہوئے ہیں انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرانیات کو "خیرات و اصلاح" کے ماتحت نہیں جگہ دی گئی ہے بلکہ اب اس کے وجود کو علیحدہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ان سب باتوں سے آپ پر واضح ہو جانا چاہئیے کہ اب کہیں لفظ عمرانیات کو ماہرین فن علمی تعنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس کے معنی میں سے عملی پہلو کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔

علم و عمل کے درمیان فرق کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسے اب ہم اصولی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا بہترین ذریعہ یہ ہوگا کہ خود اس فرق کو اجاگر کر کے دکھائیں جس کا احساس دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ قدما کے ہاں جو "عملی" اور "نظری" کی بحث تھی اس سے ہم اپنے آپ کو بالکل علیحدہ رکھیں گے اس لئے کہ اس کے الجھاؤ میں پڑ کر پھر نکلنا بہت دشوار ہے۔ اس کے متعلق ہم بس اتنا کہیں گے کہ یہ بحث بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور "نظری" اور "عملی" میں جو باہم امتیاز کیا گیا ہے اس میں ایک حد تک صداقت کا پہلو نظر آتا ہے۔ قدما کے ہاں "نظری" اسے کہتے تھے جس پر آدمی کو عمل کرنا چاہئیے اور "عملی" اسے کہتے تھے جس پر آدمی عمل کرسکتا ہے "نظری" کی نوعیت عام اور مجرد تسلیم کی جاتی تھی اور "عملی" کا شمار محسوس اور تعین میں ہوتا تھا۔ اگر ایک طرح سے دیکھئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- عمرانیات کی پچاس سال کی تحقیق" جو سنہ ۱۹۲۶ء میں "امریکی مجلۂ عمرانیات" میں شایع ہوا۔

باب۲ تو یہ دونوں ایک دوسرے کی متضاد ہیں لیکن ویسے درا صل ان میں بہت کچھ اشتراک خیال پایا جاتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ "نظری" اور "عملی" دونوں کا مدعا فی الحقیقت عمل ہوتا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کا نقطۂ نظر بلند ہے اور دوسرے کا ذرا پست ۔ مگر مقصد دونوں کے ایک ہی پیش نظر ہے ۔ دونوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا پر اپنا اثر کیونکر ڈالا جائے اور اپنی مصلحتوں اور اپنی خواہشوں کے مطابق اس کی کیونکر تنظیم کی جائے مگر خالص علم کا مقصد یہ نہیں ہوتا ۔ اس کا مقصد اثر آفرینی نہیں بلکہ معرفت ہے ۔ علم کا مقصد یہ نہیں کہ دنیا کے لئے کوئی نئی راہ تلاش کرے بلکہ وہ تو اس کی جستجو کرنا چاہتا ہے کہ دنیا کیونکر اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالتی رہی ہے ۔ وہ دنیا کی رفتار میں تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی ؟ اسی سے ہمیں علم اور فن کے فرق کا اندازہ ہو جانا چاہئے ۔ فن کا مقصد عین ہے اور علم کا حقیقت ۔ فن سے انسانی چلن کے ضابطے مقرر ہوتے ہیں اور علم سے قوانین وجود میں آتے ہیں ۔ فن سے مستقبل کی تشکیل ہوتی ہے اور علم ماضی اور حال کی تحقیق کرتا ہے ۔ چنانچہ فن کی نوعیت ہمیشہ موضوعی ہوا کرتی ہے اور علم کی معروضی غرضکہ ہمارے نزدیک فن اور علم کا وہی فرق مانا جاتا ہے جو قدما کے ہاں "نظری علم" اور "عملی علم" میں مانا جاتا تھا ۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ علم کا منصب یہ نہیں کہ وہ نظرئیے بنائے، برخلاف اس کے اس کا تو بس یہ کام ہے کہ حقایق کائنات کی تصدیق کرے ۔ اگر علم کے باب میں "نظریہ" کا لفظ کبھی استعمال کیا جائے تو اس سے اجمالی تصورات کا مجموعہ مراد لینا چاہئیے ۔ یہ درست ہے کہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں انسان نے مدتوں تک صرف عمل کو اہمیت دی اور نظرئیے اور فن تو کہیں بہت بعد میں جا کر وجود میں آئے ۔ علم (سائنس) ان سب کے بعد میں آیا ۔ اس پر تعجب نہیں کہ انسان کے اور عالم طبیعی اور عالم نامی کے درمیان جو تعلق ہے اس کی نسبت علم کی تدوین مقابلۃً جلدی وجود میں آئی ۔ اس کی وجہ

باب ۲

یہ تھی کہ اس باب میں جس مواد سے واسطہ پڑا اس میں کسی قسم کی منطقی پیچیدگی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا علم بھی پہلے مدون ہوا۔ اس کے بالکل برعکس اجتماعی زندگی اپنے تئیں ان حقایق سے علیحدہ نہ کر سکی جو قرنہا قرن سے اس کے وجود کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان حقایق کو تاریخ کہا جاتا تھا۔ کہیں انیسویں صدی عیسوی میں جا کر اسے سارے طومار میں علمی نظم و ترتیب پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس خیال کو دو وجوہ کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پہلی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بدولت یہ احساس پیدا ہوا کہ فن کی رہنمائی کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔ فی الحقیقت عالم عمرانی میں ہمارے عمل کی اثر آفرینی اور وسعت کا دارو مدار اس امر پر ہے کہ ہم اس کی اصلیت کو جانیں اور پہچانیں۔ پھر اس کے علاوہ قطع نظر اس کے افادۂ عملی کے، علم بجائے خود ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ نفس انسانی کی اعلیٰ ترین خواہشیں اس سے پوری ہوتی ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن کی تربیت ہوتی ہے اور اسی کے توسط سے ہمیں اس رشتہ کا احساس ہوتا ہے جو انسان اور اس کے گرد و پیش میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اسی کی بدولت ہم پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ سب انسان ایک ہیں اور وہ ایک دوسرے کے تابع ہیں۔ ان سب وجوہات کی بنا پر آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علم نے کس قدر جلد ترقی کر کے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لیا۔ [1]

[1] مذکورۂ بالا خیالات کے مزید تجزیے کے لیے ہم اپنی تصنیفات میں سے حسب ذیل کتب کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں:- (۱) "علم اور فن اجتماعی نقطۂ نظر سے"۔ یہ مضمون کی صورت میں "عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن کے سالنامہ" کی پہلی جلد میں شایع ہو چکا ہے۔

(۲) "معاشیات میں علم اور فن کی حیثیت"

(۳) "فلسفۂ علوم اجتماعی" کی پہلی جلد کا نواں باب اور تیسری جلد کا گیارھواں باب ملاحظہ ہو۔

باب ۲

جس مہتم بالشان تحریک کے زیر اثر علوم کی تدوین ہوئی اسی تحریک کی بدولت عمرانیات بھی وجود میں آئی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمرانیات کا تعلق نہ تو انسانی چلن سے ہے اور نہ ہم اسے فن کہہ سکتے ہیں بلکہ وہ محض علمی نوعیت کی تحقیق ہے۔ اب ہمیں اس کی مخصوص نوعیت متعین کرنی ہے۔

تیسرا باب

عمرانیات کوئی اختصاصی علم نہیں ہے! ہم نے ابھی ابھی جس تحریک کا ذکر کیا ہے اس کے اثر سے انیسویں صدی عیسوی میں متعدد اجتماعی علوم وجود میں آئے جنھوں نے مخصوص عمرانی تحقیق کے مقصد کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ ان علوم نے مختلف عہدوں اور مختلف مقاموں کی اجتماعی زندگی کے سلسلہ واقعات کی کڑیاں ملا کر اپنے نتائج اخذ کیے۔ چنانچہ ان علوم میں سے بعض کے نام یہ ہیں:—

(۱) تاریخ معاشیات یا علم المعیشت۔ اسے معاشیات کے فن سے جدا تصور کرنا چاہیے[1]۔

(۲) تاریخ رسوم یا علم رسوم۔ اسے اخلاقیات سے الگ رکھنا چاہیے[2]۔

(۳) تاریخ قانون یا علم فقہ۔ یہ قانون بنانے والے یا جج یا وکیل کے فن سے علیحدہ چیز ہے۔

(۴) تاریخ ادارہ ہائے سیاسی یا سیاسیات۔ اسے عملی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان علوم کے پہلو بہ پہلو عمرانیات کی جگہ کہاں ہوگی؟

---

[1] ملاحظہ ہو فرنان فورے کا مضمون "علم اور فن" یہ مضمون قاموس علم المعیشت میں شایع ہوا ہے جو لیون سے کے زیر ادارت طبع ہوئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو لیوی برول کی کتاب "اخلاق اور علم رسوم" (مطبوعہ ۱۹۰۳) اور "حقائق اخلاقی کا علم" (مطبوعہ ۱۹۲۴)

باب ۳

اس ضمن میں ایک سیدھی سادی بات یہ پیش کی جاتی ہے کہ ان علوم کی دستبرد سے جو کچھ بچے اسے عمرانیات اپنا موضوع بحث قرار دے۔ ان علوم میں سے ہر ایک کے تحت میں خاص قسم کے مظاہر اجتماعی آتے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ ہم ان مظاہر کی اصلیت کی نسبت غور کریں زیادہ اچھا ہو اگر ہم پہلے ان عناصر کی تحقیق کرلیں جن کی بدولت وہ پیدا ہوتے ہیں نیز ان عناصر کی ترکیب کا پتہ چلائیں۔ چنانچہ علم الحیات میں بعینہٖ اسی طرح وظایف کی تحقیق سے پہلے اعضا کا بیان آتا ہے۔ اسی طرح سے اگر اجتماعی زندگی میں بھی مختلف اعضائے عمرانی کے الگ الگ علوم تدوین پالیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کے ذریعہ سے انسانی جماعتوں کی مختلف بناوٹوں یعنی معاشری عناصر کی گوناگوں گروہ بندیوں کا حال معلوم ہوگا۔ اگر ہم عمرانیات کا نصب العین یہی قرار دیں تو کیا یہ درست نہیں ہوگا؟

خود اس خیال کے دو پہلو ہیں۔ ایک عام پسند ہے اور دوسرا علمی۔ اب ہم ان دونوں کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

عام بول چال میں آپ نے "مسئلہ اجتماعی" کی نسبت بہت مرتبہ سنا ہوگا۔ اس سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کی جنگ مراد لی جاتی ہے گویا کہ سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش کے سوا معاشرہ کو اجتماعی زندگی کے کسی اور مسئلہ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ یہ سچ ہے کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں نے اپنی تنظیم اس ڈھب سے کی ہے کہ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ان کے روز کے جھگڑے آگے چلکر ایک ہولناک تصادم کی صورت نہ اختیار کرلیں۔ سب سے پہلے کارل مارکس نے اس کی جانب محققین عصر کی توجہ مبذول کرائی۔ کارل مارکس ہی نے سب سے پہلے طبقاتی جنگ کے واقعات کی چھان بین کی اور انھیں ایک عام کلیہ کے تحت میں پیش کیا۔ چنانچہ بعضوں کا عقیدہ ہے کہ اس نے عمرانیات کے مردہ جسم میں روح پھونک دی اور بعض تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ اسی نے سب سے پہلے عمرانیات کے علم کی بنا ڈالی۔

میری دانست میں اس خیال کی غلطی اور سقم کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم معاشرہ کے مختلف طبقوں کی کشمکش کو بڑی اہمیت دینے سے انکار نہیں کرتے۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں اس افسوس ناک حقیقت کو مٹانے یا اس کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن اس سے بھی بڑھ کر معاشرے کو اور دوسری کشمکشوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اقوام کے تصادم کے آگے لوگ طبقاتی جنگ کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ طبقاتی تصادم اور مصالحت کے علاوہ اور دوسرے ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن کا تعلق اس فن سے ہے جو اجتماعی زندگی کے چلن میں برتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ عمرانی علوم طبقاتی جنگ و مصالحت کے واقعات کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے مگر ہم ان کا منتہائے مقصد بھی صرف اس کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہ علم جو انسانی گروہ بندیوں کی تحقیق اپنا موضوع قرار دیتا ہے اس مسئلہ کو جزوی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ جب آپ انسانی گروہ بندیوں کے متعلق تحقیق کرنے بیٹھیں گے تو آپ پر کھلے گا کہ معاشری طبقوں کے علاوہ آپ کو نسلوں، خاندانوں، قبیلوں، شہروں، ریاستوں، پیشوں، انجمنوں، اور ان تمام نظاموں کا جائزہ لینا ہے جنھیں ہم آئندہ ابواب میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ چنانچہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اور دوسرے مظاہر اجتماعی کو پس پشت ڈال کر عمرانیات محض طبقاتی کشمکش کے واقعات پر اپنا دائرۂ بحث محدود کر دے۔ بلاشبہ معاشرہ کے مختلف طبقوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری ہے مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ عمرانیات بس اس سے آگے اپنا قدم ہی نہ بڑھائے۔

عمرانیات کے دائرۂ بحث کے متعلق جو یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ اسے صرف معاشرہ کے مختلف طبقوں کے متعلق واقعات کی تحقیق کرنی چاہئے۔ اگرچہ بالکل بے بنیاد خیال ہے مگر اس میں ذرا سا صداقت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس طرح صرف معاشرہ کے طبقوں کے ذکر کو ہم

باب ۲

عمرانیات سے تعبیر نہیں کر سکتے اسی طرح ہر گروہ بندی کے متعلق تحقیق کرنا عمرانیات کے دائرۂ بحث سے خارج ہے چنانچہ بعض علمائے عمرانیات نے اس مسئلہ کی نسبت کوئی پچیس سال ہونے آئے اپنے خیالات ظاہر کئے تھے۔ یہ ہے عمرانیات کے تصور کی علمی نوعیت جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ یعنی یہ کہ عمرانیات کو صرف اجتماعی زندگی کی مختلف صورتوں سے بحث کرنی چاہیئے اور اسے معاشیات، علم رسوم اور سیاسیات کیلئے ان کے وظائف کی تحقیق چھوڑ دینی چاہیئے۔ عمرانیات کسی معاشرہ کے عناصر انسانی کی تحقیق کر کے یہ بتا سکتی ہے کہ ان پر عناصر غیر انسانی یعنی زمین، ماحول، جمادات، نباتات، اور حیوانات کا کیا اثر مترتب ہوا؟ وہ مختلف انسانی گروہ بندیوں کی نسبت، جن کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے تحقیق کر کے نتائج اخذ کرے گی۔ عمرانیات کے موضوع کی یہ دونوں نوعیتیں گویا اس سنگ بنیاد کا کام دیں گی جن پر ان علوم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے جو اجتماعی وظایف اور اس کی بے شمار پیچیدگیوں سے بحث کرتے ہیں۔

عمرانیات کے متعلق مذکورہ بالا نقطۂ نظر زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اجتماعی عناصر کی تدوین عمرانیات کے وجود میں آنے سے قبل دوسرے علوم کر چکے تھے اور عمرانیات کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ان علوم کو ان کے موضوع سے محروم کر دے۔ چنانچہ علم نسل اور علم مردم شماری بہت قدیم زمانے سے برابر چلے آ رہے ہیں۔ موخر الذکر میں انسانی آبادی اور اس کی چھوٹی چھوٹی تقسیموں سے بحث کی جاتی ہے۔ ابھی حال میں ایک اور نیا علم نکلا ہے اور خوب ترقی پر ہے۔ اس سے ہماری مراد انسانی یا عمرانی جغرافیہ ہے۔ اس کا موضوع تحقیق یہ ہے کہ انسان اور اس کے گرد و پیش کے مابین کیا تعلق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا نوعیت کی علمی تحقیق عمرانیات کے تحت نہیں لا سکتے جس زمانے میں اجتماعی وظایف کے علوم وجود میں آ رہے تھے اسی زمانے میں عمرانیات

باب ۳

کی نئی نئی اصطلاح بنی تھی۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے متعلق دوسرے علوم کیلئے "علم ترکیب اجتماعی" کی اصطلاح بنالی گئی[1]۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ "عمرانیات" کو عام طور پر ایک مخصوص علم کی حیثیت حاصل ہوگئی چنانچہ ماہرین عمرانیات کی مرضی کے مطابق لفظ عمرانیات اپنے وسیع معنوں میں رائج ہوگیا۔ ظاہر ہے ماہرین عمرانیات کی یہ خواہش بالکل فطری تھی کہ اس لفظ کے معنی محدود نہ ہونے پائیں۔ ان کی یہ خواہش بالکل اسی طرح تھی جیسے علم کائنات اور علم الحیات کے ماہروں کی خواہش کے موافق یہ دونوں علوم پوری فطرت طبیعی اور فطرت حیاتی پر حاوی ہیں۔ اسی طرح علمائے عمرانیات اپنے علم کو پوری فطرت اجتماعی پر حاوی کرنا چاہتے تھے۔ دراصل عمرانیات کے بانی آگسٹ کونت نے اس کا یہی تصور قائم کیا تھا اور اسی نہج پر اس کی تدوین کی گئی[2]۔ عمرانیات کی جو تعریف ہم نے پیش کی ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے غلط ٹھہرائیں۔ ہاں "عمرانیات" کی جو اصطلاح ہے اس پر اجتماعی تحقیق کی کسی ایک شاخ کو پورے طور پر قابض ہونے کا دعوے دار نہیں ہونا چاہئے، چاہے بجائے خود وہ شاخ کتنی بھی مفید کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ان اسباب کی بناپر عمرانیات کو اختصاصی علوم کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی ہے

۱۔ "عمرانیات کے سالنامے" میں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۲۔ ہم نے اپنی کتاب "فلسفۂ علوم عمرانی" میں منطقی اصول پر جملہ علوم عمرانی کی فہرست درج کی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اول۔ دسواں اور گیارھواں باب۔ ان ابواب کا عنوان "علوم اجتماعی کا منتہائے مقصد" ہے۔

چوتھا باب

کیا ہم عمرانیات کو معاشرے کی عام تحقیق سے تعبیر کر سکتے ہیں؟

ہم ابھی یہ بتا چکے ہیں کہ عمرانیات ہمارے نزدیک نہ تو اجتماعی زندگی کا فن ہے اور نہ یہ کوئی اختصاصی علم ہے۔ چنانچہ اس کا موضوع سوائے معاشرہ کی عام تحقیق کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں ہم آگست کونت کے خیال کا تتبع کر رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ اس نے جس علم کی بنا ڈالی تھی وہ اب بہت کافی ترقی کر چکا ہے۔ جوں جوں عمرانیات کا علم وسیع ہوتا گیا اسیقدر اس میں نئے نئے مسائل کے شاخسانے پیدا ہوتے گئے۔ اب ہم آگست کونت کے مثل اس پر اکتفا نہیں کر سکتے ہیں کہ عمرانیات کی مجموعی تعریف کر دیں اور بس۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی تعریف کرتے وقت کمال صحت کو ملحوظ رکھیں۔

ہم نے ابھی عمرانیات کی جو تعریف کی تھی اس کی دو تاویلیں کیجا سکتی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عمرانیات اجتماع انسانی کی عام تحقیق سے تعلق رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بجائے خود ایک مکمل علم ہے اور اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ عمران بشری کے مختلف پہلوؤں کی عام تحقیق کرتی ہے۔ یہ دونوں تصورات اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں اور ان دونوں کے حمایتی موجود ہیں۔

باب ۲

ایمل ڈرکیم پہلے خیال کے طرف داروں میں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عمرانیات علوم اجتماعی کے لئے بمنزلہ ضابطہ و نظام ہے[1] وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سارے اجتماعی علوم دراصل عمرانیات ہی کے اجزا ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایمل ورکیم نے اپنے "سالنامۂ عمرانیات" میں ہر جگہ اجتماعی علوم کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس مجلہ میں ان کام تصانیف کے اقتباس شایع کئے جاتے ہیں جو عمرانیات دینی، عمرانیات اخلاقی، عمرانیات قانونی اور عمرانیات معاشی پر شایع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ علم دین، علم اخلاق، فقہ، اور علم المعیشت کو ہر جگہ عمرانیات کے اجزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جن میں اصول مشترک کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ غرضکہ عمرانیات عبارت ہے ان سب علوم کی باہمدگر پیوستگی اور ان کی تکمیل سے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ان سب عناصر کے مجموعہ کا نام عمرانیات ہے۔

اب آیئے عمرانیات کے دوسرے تصور پر غور کریں۔ اس میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان سب علوم کو جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ایک دوسرے سے بالکل آزاد سمجھا گیا ہے اور ان کی خصوصیات کو بین طور پر ایک دوسرے سے جداگانہ نوعیت دی گئی ہے۔ مثلاً علم دین فقہ سے مختلف ہے اور اسی طرح علم رسوم علم المعیشت سے بالکل الگ ہے۔ ان کے باہمی اختلاف اسقدر صریح ہیں کہ ان سبھوں کو ایک ہی اصطلاح کے تحت میں لانا ممکن نہیں۔ پس لازم ہے کہ مختلف لوگ ان کی الگ الگ تحقیق کریں۔ اس لئے کہ کوئی علمی کام بھی بغیر تقسیم عمل کے اصول پر کاربند ہوئے پورا نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ ان مختلف علوم کے درمیان ایک قسم کا ربط و تعلق پیدا کر دیں۔ چونکہ ہر علم حقیقت

---

[1] ملاحظہ ہو "عمرانیات و علوم اجتماعی" جس میں ای ورکیم اور پی فاکونے اس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہ مضمون "مجلۂ فلسفہ" میں سنہ ۱۹۰۳ء میں شایع ہو چکا ہے صفحہ ۴۶۵۔

باب ۲

عمرانی کے صرف ایک رخ کا مطالعہ کرے گا اس لئے جب یہ سب علوم علیحدہ علیحدہ اپنی تحقیق کے کمال پر پہنچ چکیں گے تو اس وقت یقیناً ہم ان سب کے نتائج کا موازنہ کرکے ان میں ایک رشتۂ اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ یا اس طریقہ سے ہم اس کل کا تصور قایم کر سکیں گے جس کے الگ الگ اجزا کی تحقیق ان علوم نے کی ہے۔ دراصل عمرانیات کو یہی کام کرنا چاہیے چنانچہ اس نقطۂ نظر کے مطابق عمرانیات مخصوص اجتماعی علوم کو اپنے میں ضم نہیں کرے گی بلکہ وہ ان سب کے لئے طرۂ امتیاز کا کام دے گی۔ یہ سچ ہے کہ ہم اسے ان علوم کی مکمل عمارت سے تشبیہ نہیں دے سکتے مگر ہاں، ہم اسے عمارت کے اس بالائی حصے سے ضرور تعبیر کر سکتے ہیں جو ساری عمارت کے لئے مشترک حیثیت رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں مذکورہ بالا تصورات میں سے ہم کسے قابل ترجیح خیال کرتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کریں، یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کی حدود مقرر کردیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں تصورات میں ایسا زیادہ فرق نہیں ہے۔ ورلیم کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عمرانیات کی مخصوص تحقیقات کے ساتھ ساتھ عمرانیات کے عام نتائج کی تحقیق بھی ایک حیثیت رکھتی ہے چنانچہ اس باب میں وہ خود کہتا ہے۔[1] "بلا شبہ صرف اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو ٹھیک ہے کہ اجتماعی علوم جب خوب ترقی کر چکیں گے تو یہ ممکن ہوگا کہ ان کے نتائج میں ربط قایم کیا جائے۔ اس طریقہ سے وہ عام اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں جو ان نتائج میں مضمر ہیں۔ میرے نزدیک اگر اجتماعی علوم کے مسئلہ کو اس طور پر پیش کیا جائے تو اس میں کوئی ناقابل حل دشواری نہیں باقی رہتی۔" دوسرے تصور کے مطابق اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ مخصوص علوم اجتماعی کے ماہروں کے لئے یہ بہت مفید ہے کہ وہ ان

---

[1] ملاحظہ ہو "مجلۂ فلسفہ" سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۷۷۔

علوم سے بھی واقفیت بہم پہنچائیں جو ان کی تحقیق سے قریب قریب کا تعلق رکھتے
ہیں تاکہ وہ ان کی ترقی سے باخبر رہیں اور ان کے تحقیقی نتائج سے اپنے کام
میں مدد لیں۔ اس طرح وہ ان لوگوں کے ساتھ یک جہتی محسوس کریں گے
جو ان کے علم سے ملتے جلتے دوسرے علوم پر کام کر رہے ہیں۔ اس
سے یہ ہوگا کہ وہ ان سبھوں کو اپنی وسیع برادری میں شامل سمجھیں گے
اگر ان امور کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے تو ان دونوں مذکورۂ بالا
تصورات میں خفیف سے اصطلاحی فرق کے سوا اور کوئی بنیادی اختلاف
نہیں نظر آئے گا۔ ورکہیم کے نزدیک عمرانیات تمام اجتماعی علوم کے
مجموعہ سے عبارت ہے۔ اگر آپ اجتماعی علوم کے مجموعی نتائج کو علیحدہ
نام سے موسوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ "عمرانیات عام" کی اصطلاح اس
کے لئے وضع کر سکتے ہیں۔[1] دوسرے تصور کے مطابق اجتماعی علوم اصولی
طور پر اپنا ایک علیحدہ آزاد وجود رکھتے ہیں اور ان کے مجموعی نتائج کی تحقیق
کو عمرانیات کہتے ہیں۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کے ساتھ
لفظ "عام" کا دُم چھلا خواہ مخواہ لگایا جائے۔ جو محققین اس تصور کے
حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ خود علم عمرانیات کی اصلیت کا یہ اقتضا ہے کہ وہ
عام نوعیت رکھتی ہو۔

چونکہ یہ بحث صرف لفظوں کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا
ہے کہ اسے اور زیادہ آگے نہ بڑھایا جائے۔ دراصل الفاظ کی تعریف
مختلف نقطہ ہائے نظر سے کی جا سکتی ہے اور اس میں ہر شخص کو آزادی حاصل
ہے کہ جو نقطۂ نظر چاہے اختیار کرے۔ لیکن چونکہ کسی علم کی تحقیق میں
اصطلاحوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ضرور ہے کہ ہم عمرانیات
کی اصطلاحوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دیں۔ ہم اسی اصطلاح کو
ترجیح دیں گے۔ جس سے خود نفس عمرانیات کو فائدہ پہنچے۔ آپ جانتے

[1] "سالنامۂ عمرانیات" کی جلدیں ملاحظہ کیجئے۔

باب

ہیں کہ اس وقت عمرانیات کے عام طور پر رائج ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ اختصاصی علوم کے ماہروں کی طرف سے پیدا کی جارہی ہے۔ انھیں یہ خوف ہے کہ کہیں عمرانیات کے وسیع حلقہ میں خود انکا موضوع تحقیق ضم نہ ہوجائے۔ دراصل اجتماعی فنون کے ماہرون کو اس قسم کا اندیشہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ تو نہیں نظر آتی اس لئے کہ عمرانیات خود عملی زندگی میں براہ راست دخل دینے سے احتراز کرتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے مخصوص اجتماعی علوم کے ماہروں کی عمرانیات کی طرف سے بدظنی بدستور چلی آتی ہے چنانچہ ایک مشہور ماہر علم المعیشت نے جو نئے نئے خیالات کو جذب کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں چاہے پورے طور پر انھیں ان سے اتفاق ہو یا نہ ہو، علمائے عمرانیات کو خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ اپنے رفقاء کے ان اندیشوں کا ذکر کیا جو ان کے دلوں میں عمرانیات کی طرف سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس ماہر علم المعیشت کا نام موسیو ڈ ایل کیوسیر ہے۔ انھیں عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن نے سنہ ۱۹۱۳ء کے لندن کے اجلاس کے لئے صدر منتخب کیا تھا۔ چنانچہ اس اجلاس کی افتتاحی تقریر میں موصوف نے علمائے عمرانیات کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انھیں بڑے بڑے دعووں سے احتراز کرنا چاہئے اور فروتنی اختیار کرنا چاہئے[1] واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر جو کچھ کہا لفظ بہ لفظ درست ہے۔ اس وقت عمرانیات کے حامیوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ خاکساری کا جذبہ ہے۔ اگر عمرانیات اپنے حوصلوں اور امنگوں کو ضبط کے تحت لے آئے تو امید ہے کہ وہ بہت جلد عام طور پر مقبول ہوجائے گی۔ اگر آج وہ یہ دعوی کرنا ترک کردے کہ وہ اجتماعی علوم کے مجموعے سے عبارت ہے، تو ایسی صورت میں توقع ہے کہ دوسرے اجتماعی علوم کے ساتھ اس کا سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔ اگر

[1] "عمرانیات کی بین الاقوامی انجمن کی سالانہ رپورٹ" ملاحظہ ہو۔ جلد گیارھویں، صفحہ ۴۸ سنہ ۱۹۰۷ء

عمرانیات دوسرے مخصوص اجتماعی علوم کی آزادی کو معرض خطر میں نہ ڈالے تو یقیناً یہ علوم بھی اس کی بقا اور اس کے حق حیات کو تسلیم کر لیں گے اس طریقہ سے باہمی سلوک و رعایت سے یہ فائدہ ہو گا کہ سارے اجتماعی علوم کی اپنی اپنی الگ الگ حدود متعین ہو جائینگی اور خود نفس علم کی بڑی خدمت ہو سکے گی۔ دراصل تحدید میں بڑے فائدے ہیں۔ اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ ہمارے نزدیک عمرانیات کو اسی اصول پر عمل کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے میں وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و صلح کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گی اور وہ سب کے سب اس کے ممد و معاون بن جائینگے۔ چنانچہ علمائے عمرانیات کا یہ فرض ہے کہ عمرانیات کو اس کی مقررہ حدود سے باہر نہ نکلنے دیں۔ آخر میں اس پوری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عمرانیات ہمارے نزدیک اجتماعی علوم کے مجموعے کو نہیں کہتے بلکہ وہ اُن کے باہمی امتزاج کا نام ہے۔

پانچواں باب

ہم نے پچھلے ابواب میں عمرانیات کی جس خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے اب اسکے نتیجہ کو ذرا اور اجاگر کر کے پیش کرتے ہیں۔ در اصل یہی نتیجہ ہماری اس ساری تحقیقات کا لب لباب ہے جو اب تک ہم نے کی ہیں۔ ہم نے ابھی یہ کہا تھا کہ عمرانیات سارے مخصوص اجتماعی علوم پر حاوی ہے، ان علوم نے پورے عالم عمرانی کو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے اور عمرانیات ان مختلف حصوں میں رشتۂ اتحاد کا کام کرتی ہے۔ ان علوم میں سے ہر ایک کے پیش نظر ایک متعین مقصد ہوتا ہے، اور عمرانیات ان سبھوں کے متحدہ مقصد کو اعلیٰ نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مخصوص علوم ہی کو ہم علوم کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ عمرانیات تو در اصل ان سب علوم کا فلسفہ ہے۔ چنانچہ عمرانیات کی تعریف کے باب میں ہم اپنی تحقیق کے اس آخری نتیجہ پر پہنچ گئے کہ عمرانیات در اصل مخصوص اجتماعی علوم کے فلسفہ کو کہتے ہیں۔

ہم اس موقع پر اس بحث کو چھیڑنا بے سود سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور علم میں ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ فلسفۂ ایجابی یا فلسفۂ علوم سے جس قسم کی تحقیقات مراد لی جاتی ہے اس کی نوعیت خالص علمی تحقیق سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ آگسٹ کونت نے اپنی کتاب "فلسفۂ ایجابی کے اسباق" میں اس فرق کو اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔ فلسفہ اور علم میں بس وہی فرق ہے

باب ۱

جو تجزیہ و ترکیب میں ہوتا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ مخصوص حقایق کی تحقیق کرے اور ان سے قوانین اخذ کرے۔ اور اعلیٰ مسائل پر بحث کرنے کا تعلق فلسفہ سے ہے۔ کسی علمی موضوع کے عام مسائل کی تحقیق کو اس علم کا فلسفہ کہتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد کسی تحقیق کے ابتدائی اور انتہائی مسائل کے حل سے ہے۔ کسی علمی تحقیق کو شروع کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ آپ اس علم کا منتہائے نظر اور اس کا طریقۂ تحقیق متعین کرلیں اور یہ تحقیق اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جائے گی جب تک کہ آپ نے اپنے نتائج کا استنباط نہ کرلیا ہو۔ اگر آپ اس اصول کو عمرانیات پر عائد کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کیونکر اس کی بدولت اجتماعی علوم میں ہم آہنگی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات اصولی طور پر خاص خاص اجتماعی علوم کے دائرۂ بحث کو متعین کرتی ہے اور انھیں اس طریقہ سے آگاہ کرتی ہے جس کی کسوٹی پر انھیں واقعات کی جانچ کرنی چاہئے اس طور پر اجتماعی علوم کے طریقۂ تحقیق میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور ان علوم کے دائرۂ بحث کے مقرر ہو جانے سے ایک تو یہ ہوتا ہے کہ سارے مظاہر عمرانی کسی نہ کسی علم کے تحت میں آجاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایک علم دوسرے علم کے حلقہ میں بے جا تصرف اور دخل اندازی نہیں کرسکتا چنانچہ اسکی وجہ سے کسی مسئلہ کی چھان بین میں دوہری محنت بچ جاتی ہے اور ہر علم دوسرے کے طریقۂ تحقیق اور تجربے سے استفادہ کرسکتا ہے۔ اگر ایک جگہ کوئی خاص طریقہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا تو دوسرے علوم بھی اسے اپنے خاص حالات سے مطابق کرکے استعمال کرسکتے ہیں۔ پھر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عمرانیات کی بدولت ان سارے علوم کے نتائج تحقیق ایک جگہ جمع کردیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ عمرانیات اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ حقایق عمرانی کے مختلف پہلوؤں کو آپ چاہے تحقیق کی آسانی کی وجہ سے عارضی طور پر ایک دوسرے سے جدا کرلیں گر واقعی زندگی میں یہ سب پہلو

آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف عناصر کا باہم تعاون ضروری ہے اس لئے کہ وظائف عمرانی بایکدگر مربوط ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ انسان کے ارتقا کی منزلیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ان کا سلسلہ برابر جاری چلا آتا ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عمرانیات کی بدولت اجتماعی علوم کی ابتدائی اور انتہائی حالتوں میں کیونکر ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عمرانیات کا کام یہی ہے کہ اس امتزاج کی تکمیل کرے۔

لیکن کیا اس کی کوئی صورت ممکن ہے کہ ہم کسی علم کی ابتدا اور انتہا کو ایک دوسرے سے الگ واضح کرسکیں؟ نظری اعتبار سے بیشک یہ ممکن ہے لیکن عملی طور پر اس میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ عینی نقطۂ نظر سے ہم ان میں فرق کرسکیں۔ مثال کے طور پر یہ فرض کیجئے کہ اجتماعی علوم کی کوئی تحقیق پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ ضرور ہے کہ اس تحقیق کی ایک تمہید ہو اور آخر میں اس کا نتیجہ ہو۔ فی الحقیقت یہی تمہید اور نتیجہ عام عمرانیات کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اول تو ہم یہی نہیں فرض کرسکتے کہ اجتماعی علوم کی کوئی تحقیق واقعی مکمل ہو چکی ہے۔ دراصل اس عمارت کی تکمیل ہنوز باقی ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوا اس وقت تک دونوں کام ساتھ ساتھ چلتے رہنے چاہئیں۔ یعنی یہ کہ مخصوص اجتماعی علوم کی الگ الگ تحقیق کا کام بھی جاری رہنا چاہئے۔ اور عمرانیات کو بھی ساتھ ساتھ اپنی تمہید و نتائج کو وسیع کرکے علم کی اصلی صورت میں پیش کرنا چاہئے۔ اس طور پر جوں جوں مخصوص اجتماعی علوم ترقی کرتے جائیں گے اس کے دوش بدوش عمرانیات بھی اپنی تکمیل کرتی جائے گی۔ چاہے بظاہر یہ بات کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ معلوم ہو۔ لیکن یہ صورت ممکن ہے کہ اجتماعی علوم کا یہ ابتدائی اور آخری کام ساتھ ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ چنانچہ آئندہ جب ہم اس پر

باب ۵

بحث کریں گے تو جان بوجھکر مختلف علوم اجتماعی اور عمرانیات کو خواہ مخواہ ایک دوسرے سے بالکل جدا کر کے نہیں پیش کریں گے۔ جہاں کہیں ہم ان کے باہی اختلاف کو ظاہر کریں گے وہاں یہ ضروری نہ ہوگا کہ ہم انہیں عمرانیات سے متضاد کر کے دکھائیں۔

بلکہ ہم صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم نے پچھلے ابواب میں جس تحقیق کا ذکر کیا ہے اسے عمرانیات کے ضمن میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان ابواب میں ہم نے عمرانیات کی اہمیت کو تجریدی طور پر متعین کر لیا ہے۔ اب آگے چلکر ہم یہ بتائیں گے کہ کیونکر قابل محسوس طور پر عمرانیات نے اپنے منصب کو نبا ہا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہو گا کہ ہم ان نتائج کی چھان بین کریں جو محض عمرانیات کی بدولت منظر عام پر آئے۔ ظاہر ہے اس کے لئے بڑی تفصیل درکار ہے مگر چونکہ اس کتاب کا دائرۂ بحث محدود ہے اس لئے ہم اس کے اندر رہنے کی کوشش کریں گے۔ پھر بھی اتنا تو ہم ضرور کریں گے کہ ان سب امور کی جانب اشارہ کردیں جن کا تعلق عمرانیات کے موضوع کے اہم مسائل سے ہے۔ اب عمرانیات کے منطقی منتہائے مقصد کو پیش کر دینے کے بعد ہم اس کے اصلی موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حصہ دوم

چھٹا باب

عمرانیات کا موضوع بحث

معاشرہ اور اجتماعی تعلقات

کائنات مدرکہ کی جملہ موجودات کو ہم تین بڑی بڑی مدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، غیر جاندار، جاندار اور معاشرے۔ انھیں کو دوسرے لفظوں میں غیر نامی، نامی اور فوق نامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کائنات کے یہ تینوں اجزا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست بھی ہیں اور اگر ایک دوسرے اہم پہلو سے دیکھیے تو ایک دوسرے پر حاوی نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فوق نامی کی ساخت عناصرِ نامی سے ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے نامی کی بناوٹ میں غیر نامی عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ چنانچہ فوق نامی اور نامی کی ترکیب کا ڈھنگ غیر نامی سے مطلق نہیں ملتا۔ غیر نامی ان دونوں سے مواد حاصل کر کے اسے نئی نئی شکلیں دیتا رہتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ عالم اجتماعی اور عالم نامی کے درمیان

جو تعلق ہے اس کی کیا نوعیت ہے؟ ایک عام تعلق ان دونوں میں بظاہر یا یہ پایا جاتا ہے کہ عالم اجتماعی بھی اصل میں حیات ہی کے ایک پہلو کا نام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظام حیات میں دو قسم کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک وہ اندرونی تعلق جو کسی ایک عضو کے مختلف اجزا کے درمیان ہوتا ہے اور دوسرا وہ خارجی تعلق جو ایک عضو اور دوسرے عضو کے درمیان ہوتا ہے پہلی قسم کے تعلق کی تحقیق علم الحیات کا موضوع ہے اور دوسری قسم کے تعلق کو عمرانیات اپنا موضوع بحث قرار دیتی ہے۔

اگرچہ اس مسئلہ کی نسبت آیندہ متعدد دفعہ ہم ذکر کریں گے مگر اس جگہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس سارے مسئلہ کی اصلیت بس اتنا امتیاز کرنے پر منحصر ہے کہ اندرونی نامی تعلقات ہمیشہ غیر شعوری طور پر وجود میں آیا کرتے ہیں۔ برعکس اس کے خارجی اجتماعی تعلقات ہمیشہ اصولاً شعوری ہوتے ہیں۔ ذی روح ہستیاں باہمی صلاح مشورے سے اپنے خارجی تعلقات و اعمال کو شعوری تصور کے تابع رکھتی ہیں۔

چنانچہ اس اصول کی صراحت کے ساتھ ہم پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ عالم نامی اور عالم اجتماعی کی وسعتیں برابر نہیں ہیں۔ عالم اجتماعی دراصل عالم نامی کے سامنے بہت چھوٹا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے صرف ذی روح ہستیاں ہی قائم کر سکتی ہیں سیاروں اور سالمات کی اجتماعی زندگی استعارہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ذیل میں ہم اس خیال کی مزید تشریح کریں گے کہ کیونکر ہم عالم اجتماعی کو مختلف حیثیتوں سے بمقابلہ عالم نامی کے محدود سمجھتے ہیں۔ ہماری کوشش ہو گی کہ جہاں تک ممکن ہے اس تصور کو صحت کے ساتھ پیش کریں۔

اول تو ہمیں یہ بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جانداروں میں بعض ایسے ہیں جو معاشرہ میں زندگی نہیں بسر کرتے۔ مثلاً نباتات۔ یہ ہمیں تسلیم

باب ب

ہے کہ بعض دفعہ اس خیال کی تردید کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دو مختلف انواع کے نباتات میں اور ایک ہی نوع کے مختلف نباتات میں اجتماعی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ اول الذکر کی مثال ہمیں شمپیون (Champignon) اور کائی میں ملتی ہے جو ملکر لنش (Linchen) کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر الذکر کی مثال ہمیں شاہ بلوط شمشاد اور چیڑھ کے درختوں میں ملتی ہے جن کے جھنڈوں سے جنگل بنتے ہیں۔ اس دوسری مثال سے آپ ایک اور تیسری مثال بھی نکال سکتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ جنگل میں صرف ایک ہی نوع کے نباتات نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے بڑے سب ہی قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک نوع کے درخت دوسرے انواع کے مقابلہ میں کثرت سے پائے جاتے ہوں جس کی بدولت اس جنگل کی ایک خاص خارجی صورت پیدا ہو جائے اور اس کا ایک خاص نام پڑ جائے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے درختوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے بڑے پڑوسیوں کے سایہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہمیں باغات میں ملتی ہے جہاں درخت ایک طرح کی اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس موضوع کا تعلق علم نباتات سے ہے۔ اس علم کی تحقیق میں ان دلچسپ مسائل کی نسبت معلومات دستیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ درخت جو قریب قریب ہوتے ہیں آپس میں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں اور ان کی حیات نامی ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس اثر و تاثر کی تہ میں قرب مکانی کا اصول کارفرما ہوتا ہے اور اس کے اسباب یا تو طبعی نوعیت کے ہوتے ہیں یا ان کا تعلق علم حیاتیات سے ہوتا ہے جس طرح نباتاتی جغرافیہ کا علم اس اثر کی تحقیق کرتا ہے جو زمین اور آب و ہوا کسی خاص درخت پر ڈالتے ہیں اسی طرح نباتاتی عادات کے

علم میں ان کی باہمی اثر آفرینی کے متعلق چھان بین کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس جگہ "نباتاتی عمرانیات" کا ذکر کریں تو غالباً یہ ذرا قبل از وقت ہوگا۔

نظم حیات کے ارتقا میں عالم نباتات کے بعد عالم حیوانات کا درجہ ہے۔ اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ عالم حیوانات میں صحیح معنی میں اجتماعی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ حقیقت مدتوں سے مسلم چلی آتی ہے اور اس کے متعلق متعدد فاضلوں نے تحقیق کی ہے۔ الفرے اسپیناس نے اپنی مشہور کتاب "حیوانی معاشرے" میں اس مسئلہ کی نسبت نہایت قابل قدر معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ پھر اس کے بعد اور دوسروں نے بھی اس موضوع پر قلم فرسائی کی لیکن سوائے ضمنی تفصیلات کے اور کوئی خاص اضافہ نہیں کیا گیا۔ ہم اس جگہ صرف اس قدر اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ بعض ذی شعور جانوروں میں گروہ بندی بالکل عمرانی اصول پر ہوتی ہے اور بعض جانوروں کی گروہ بندی میں یہ خصوصیت اس قدر نمایاں نہیں ہوتی۔ چنانچہ Siphonophores میں اگرچہ ہمیں کسی قسم کی گروہ بندی نہیں نظر آتی مگر یہ کہ وہ تقسیم کار کے اصول پر سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ Ascidles کا بھی بعینہ یہی حال ہے۔ ان میں بھی تعاون عمل پایا جاتا ہے لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی زندگی اجتماعی اصول کے تابع ہے۔ مذکورہ مثالوں میں معاشروں کا وجود نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہایت پیچیدہ نظم حیات کے نمونے ہیں مگر Hymenopteres کے گروہ (جیسا ہے وہ چونٹی کی قسم سے ہوں یا شہد کی مکھی کی قسم سے) مچھلیاں، چڑیاں، اور دودھ پلانے والے جانور اجتماعی اصول پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے جسموں کی ساخت ان جانوروں کی ساخت سے بالکل مختلف ہوتی ہے جن کی نسبت ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے۔ موخر الذکر کے اعضا کی بناوٹ میں شعور و اختیار کو دخل ہوتا ہے حالانکہ

باب ۱

اولی الذکر کے اعضا کی ساخت غیر ارادی اتحاد سے عبارت ہوتی ہے
پھر ان دونوں کی نفسیاتی زندگی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی
ہے۔ موخر الذکر کی گروہ بندی افراد کے اشتراک مقصد کا نتیجہ ہوتی
ہے مگر اولی الذکر کے ہاں اس قسم کی کسی نفسیاتی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا
چنانچہ ان مثالوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ معاشرے وہیں وجود
میں آتے ہیں جہاں عقل وشعور کی کارفرمائی ہے۔

اب آخر میں انسان کو لیجیئے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ انسانی زندگی
میں اجتماعی اصول کو خوب فروغ ہوا۔ اور ہمیں بھی اپنی تحقیق کی خاطر
مختلف قسم کے معاشروں میں انسانی معاشرے سے سب سے زیادہ
دلچسپی ہے۔ اب سوال یہ ہے انسانی معاشروں میں وہ کون سے
معاشرے ہیں جو ہماری توجہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اس باب
میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ آگسٹ کونت
کے زمانہ میں جب عمرانیات نئی نئی وجود میں آئی تھی اس وقت اس
کی تحقیق کا رجحان اعلیٰ انسانی معاشروں کی جانب مائل تھا۔ وجہ
اس کی یہ تھی کہ عمرانیات کے پیش نظر صرف مغربی دنیا تھی۔ مغربی
معاشرے کے علاوہ عمرانیات دنیا کے دوسرے معاشروں کو ہیچ
سمجھتی تھی۔ لیکن آج کل عمرانیات کا رجحان اس کے بالکل برعکس پایا جاتا ہے
امیل درکیم کے مسلک کے محققین، جو انگریزی ماہرین علم الانسان اور
ماہرین اساطیر سے بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں، ان قدیم انسانی آبادیوں
کی تحقیق پر بہت زور دیتے ہیں جو ابھی تمدن کی بالکل ابتدائی حالت
میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ غرضکہ عمرانیات کے ان دونوں رجحانوں
کے متعلق آپ کو دلائل ملیں گے۔ درکیم کا خیال ہے کہ انسانی
آبادیوں کی ترقی یافتہ صورت کو بخوبی سمجھنے کے لئے ان کی ابتدائی
حالت کا جاننا ازبس ضروری ہے۔ فی الحقیقت اس کا یہ دعویٰ
بالکل درست ہے مگر آگسٹ کونت کے ہاں اس کا یہ جواب

ملے گا کہ عمرانیاتی تحقیق کو محض زمانۂ قبل از تاریخ کے لئے مخصوص کردینا بے فائدہ ہے اس واسطے کہ (انسانیت آج عمرانیات سے یہ امید باندھے بیٹھی ہے کہ وہ اس کی موجودہ گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی تاکہ اس کی روشنی میں انسانی مستقبل کی تشکیل ہو سکے۔ ہمارے نزدیک آگست کونت کا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے ہماری رائے میں یہ دونوں متضاد مسلک بقول لائینز' اسی حد تک ٹھیک ہیں جہاں تک کہ وہ واقعات کی توثیق کرتے ہیں اور وہ دونوں اپنے منفیانہ پہلو کے اعتبار سے غلط ہیں"۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں انسانی معاشروں کی ابتدائی حالت کی تحقیق کو اتنی ہی اہمیت دینی چاہیئے جتنی کہ ان کی موجودہ حالت کو۔ گو ہماری دانست میں انسانی معاشروں کی موجودہ حالت کی تحقیق اس لئے زیادہ مفید ہے کہ اس کے متعلق ہمارے پاس جو مسالا موجود ہے وہ نہایت نتیجہ خیز، پیچیدہ اور اعلیٰ قسم کا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ موجودہ معاشروں سے ہمیں دلچسپی بھی زیادہ ہے۔ اور ان کے متعلق ہم مقابلۃً زیادہ قابل وثوق معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس واسطے کہ زمانۂ حال کے حقایق عمرانی کی تصدیق آسان ہے اور ماضی کی تو صرف ذہنی تعمیر ہی ممکن ہے اور خاصکر اسلئے اور بھی ہم موجودہ زمانہ کے معاشروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آج کل کے لوگوں کے محرکاتِ عمل اور انداز خیال تقریباً وہی ہیں جو ہمارے ہیں۔ برخلاف اس کے زمانۂ ماضی اور بالخصوص ماضی بعید کے حقایق عمرانی کی چھان بین کے وقت ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس زمانے کے انسانوں کی نفسی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہو گی جو آج ہماری ہے۔ دراصل اس ساری بحث کا لب لباب یہی ہے کہ ماضی اور حال کے لوگوں کے نفسی رویہ کے فرق کو محسوس کیا جائے۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے موجودہ عہد کے مہتم بالشان معاشروں کی تحقیق نہایت بصیرت افروز ہے۔ اس واسطے اور بھی کہ ہم باآسانی ان کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

ساتواں باب

حقیقت اجتماعی کے خصایص اساسی جیسا کہ ہم پچھلے بابوں میں بیان کر چکے ہیں، عمرانیات کی تحقیق کا مواد ذی روح ہستیوں کے باہمی تعلقات اور بالخصوص انسانوں کے باہمی تعلقات سے فراہم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں کہ اس اصول موضوعہ کی مزید تشریح کی جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ان تعلقات کی امتیازی خصوصیت اور ان کی اصلی حقیقت کا تجزیہ کر کے علیحدہ کریں۔

چنانچہ اس حقیقت کو دریافت کرنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں اور انھیں کوششوں کی بدولت عمرانیات کے دو مسلک وجود میں آگئے ہیں جو اب کم وبیش ایک چوتھائی صدی سے خاصکر کے فرانس میں مروج ہیں اور علمائے عمرانیات ان کی وجہ سے دو جماعتوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک مسلک کے بانی گبریل تارد ہوئے ہیں اور دوسرے کے امیل درکیم۔ حقیقت اجتماعی کے متعلق ان دونوں مفکروں نے جو اظہار خیال کیا ہے اسے ہم اس جگہ مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ہم خود اپنی ذاتی رائے بھی ظاہر کر دیں گے۔
تارد کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ معاشرہ صرف وہ ہستیاں

قایم کرسکتی ہیں جن میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مشترک زندگی کے لئے ضروری ہے کہ افراد جماعت میں یگانگت موجود ہو۔ یہی یگانگت اس جماعت کے لئے بنیاد' ذریعہ اور مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور افراد میں اشتراک حیات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان میں آپس میں ایکدوسرے کے ساتھ مماثلت نہ پائی جاتی ہو۔ اشتراک حیات کے لئے یہ ضروری ہے کہ شروع ہی سے کسی جماعت کے افراد میں مماثلت موجود ہو جو آیندہ امتداد زمانہ سے تکمیل پذیر ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مماثلت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ دراصل وہ ایک دوسرے کی نقل سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن میں یگانگت پائی جاتی ہے ایک دوسرے کی باتوں کی نقل کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ نقل یک طرفہ ہوتی ہے یعنی یہ کہ ادنیٰ طبقہ اعلیٰ طبقہ کی نقل کرتا ہے پھر کچھ عرصے کے بعد دونوں طبقے ایک دوسرے کی نقل شروع کردیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ بھی ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے کچھ نہ کچھ ضرور مستعار لیتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ نقل انسان کی خارجی اعمال کی اتنی نہیں کی جاتی جتنی کہ اس کی اندرونی زندگی کی۔ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ نقل کرنے والا بیشتر اس کے کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائے اپنے قابل تقلید نمونے کے نصب العین کو قبول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ تارد نے اس باہمی نقل کے قوانین کی اپنے نظریہ میں تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے کی نقل کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے افراد آپس میں بہت مشابہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی جدت طرازی کرتا ہے تو اس کا اثر فوراً پوری جماعت کی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ باتیں جن کا تعلق انسان کی عقل اور اس کے مفاد سے ہے بہت جلد مشہور اور مقبول ہو جاتی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو افراد کی ان

باب ۳ جدّت طرازیوں اور باہمی نقل کے قانون کو پیش نظر رکھ کر انسانیت کی پوری تاریخ معلوم کر لیں۔ تارد کا قول تھا کہ "معاشرہ کی مثال اس کپڑے کی سی ہے جس کا تانا افراد کا باہمی نقل کرنا ہے اور بانا ان کی ایجادیں ہیں"۔

تارد نے اپنی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب "قوانین نقل" میں مذکورۂ بالا خیال کو نظریہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس نے بعد میں ایک اور دوسری چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا نام "قوانین اجتماعی" ہے اس میں اس نے اپنے تصورات کو اختصار اور عمق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے طرز بیان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اس دوسری کتاب میں انسانی اعمال کی اس نے تین بڑی بڑی خصوصیات بتائی ہیں: تکرار، اختلاف اور تطابق۔ آگے چلکر وہ خود اپنے مفہوم کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ معاشرتی زندگی میں تکرار اور نقل ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ عمل اختلاف دراصل عمل نقل کی ضد ہے۔ رہا عمل تطابق تو وہ بھی کم و بیش ایک طرح کی نقل ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ غرضکہ معاشرتی زندگی کی ان تینوں خصوصیتوں میں آپ کو عمل نقل ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ دراصل ان دونوں کتابوں میں تارد کے بنیادی خیال کا جہاں تک تعلق ہے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہاں شاید مطالب کو پیش کرنے کی ظاہری صورت میں تھوڑا بہت فرق ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تارد نے اپنے اس اعتقاد میں کبھی شبہ کو راہ نہیں دی کہ انسانوں کے باہمی تعلقات میں عمل نقل کو اساسی حیثیت حاصل رہی ہے۔

درکیم کا نظریہ اس سے مختلف تھا۔ لیکن ممکن ہے بادی النظر میں ان دونوں نظریوں کا فرق صاف نہ دکھائی دے۔ درکیم اپنے نظریہ کو ایک دوسری بنیاد پر استوار کرتا ہے۔ تارد چاہتا تھا کہ اجتماعی تعلقات کی اصل روح کا سراغ لگائے۔ بہ خلاف اس کے درکیم

کے پیش نظر یہ بات تھی کہ وہ اجتماعی تعلقات کی خارجی خصوصیات معلوم کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایسے خارجی معیار کا پتہ چل جائے جس کی کسوٹی پر وہ اجتماعی مظاہر اور خالص انفرادی مظاہر کو پرکھ سکے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ معیار اجتماعی "جبر ہے"۔ چنانچہ اس کے نزدیک ہر اس حقیقت کو عمرانی حیثیت حاصل ہے جو معاشرہ کے جبر سے ظہور پذیر ہو۔ پھر وہ یہ بتاتا ہے کہ ہم اپنے معتقدات اور اپنے طرز عمل کو اپنے آپ نہیں مقرر کرتے بلکہ وہ ہمارے لئے پہلے سے ہمارے گردوپیش میں موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں تو فی الواقع اتنا اختیار بھی نہیں ہے کہ کسی دوسری قسم کے معتقدات یا طرز عمل کو قبول کریں۔ اس واسطے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنے معاشرہ کے حلقہ سے خارج کر دیئے جائیں گے۔ مذہب، قانون اور رسم و رواج اس اجتماعی جبر کی مختلف شکلیں ہیں جو معاشرہ کی طرف سے ہم پر عاید کی جاتی ہیں۔ اسی جبر کا اثر ہمارے سارے چلن پر مترتب ہوتا ہے اور ایسا ہونا اچھا بھی ہے اس واسطے کہ اسی کی بدولت ہم میں اور ہمارے دوسرے ہم جنسوں کے درمیان ایک ربط قائم ہو جاتا ہے اور ہم ان کے اعمال سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بقول پاسکال "ہماری اس غلامی ہی میں ہماری فضیلت مضمر ہے"۔ چنانچہ عہد حاضر کے ماہرین عمرانیات کے نزدیک شہر (تمدن) کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اگلے زمانہ کے معتقدین کے ہاں خدا کو حاصل تھا۔ تمدن کے بغیر نفس انفرادی کی ماہیت جاننا محال ہے بلکہ یوں کہیئے کہ اسے تصور ہی میں لانا ناممکن ہے۔

یقیناً یہ دونوں مذکورۂ بالا نظریئے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ تارڈ کے ہاں حقیقت اجتماعی عبارت ہے فرد کی اس کوشش سے جو وہ کسی نمونہ کو سامنے رکھ کر اس سے موافقت پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ درکیم کے نزدیک حقیقت اجتماعی جماعت کے اس

باب ۲ جبر کا نتیجہ ہے جو وہ اپنے عناصر ترکیبی پر روا رکھتی ہے۔ اگلے باب میں ہم اس اختلاف کے گہرے اسباب کی تحقیق کریں گے۔ اس وقت ہم صرف آپ کی توجہ اس مشابہت کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں جو ان دونوں مصنفوں کے خیالات میں پائی جاتی ہے۔ اور جس کے متعلق عام طور پر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اصل میں دونوں یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اجتماعی اور انفرادی حقیقت میں کیونکر فرق کیا جائے۔ تارد کے خیال کے مطابق نقل کا تعلق اجتماعی حقیقت سے ہے اور ایجاد کا انفرادی حقیقت سے۔ ڈرکیم کہتا ہے کہ اجتماعی حقیقت عبارت ہے اس ضابطۂ اعمال سے جو جماعت فرد پر عاید کرتی ہے۔ اور انفرادی حقیقت سے وہ طرز عمل مراد ہے جو جماعت فرد کی ذاتی اپج اور اختیار پر چھوڑ دیتی ہے۔ غرضکہ آپ نے دیکھا کہ یہ دونوں مفکر انسانی اعمال کے اجتماعی اور انفرادی عناصر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ مختلف معیاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کیوں نہ ہو۔

ہمیں اپنی ذاتی رائے قایم کرنے میں ان ہر دو مذکورہ بالا نظریوں سے بعض جگہ اختلاف ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نظریوں کا اختلاف بجائے خود اس رائے کی جانب ہماری رہبری کرتا ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ غیر مکمل ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی چلن پر کبھی نقل کا اثر ہوتا ہے اور کبھی وہ ایک مقرر راستہ پر اس لئے پڑ جاتا ہے کہ اجتماعی جبر کے ہاتھوں وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ پہلی صورت میں تارد کا خیال درست ہے اور دوسری صورت میں ڈرکیم کی رائے ٹھیک ہے۔ فی الحقیقت ان دونوں مفکروں کے اصول موضوعہ پوری حقیقت پر حاوی نہیں کہے جا سکتے۔ اس واسطے کہ ایسے انسانی اعمال کی بھی تصدیق کی گئی ہے جو نہ ایک کے اصول کے ماتحت آتے ہیں اور نہ دوسرے کے۔ مثال کے طور پر آپ

ان افراد کے اعمال کو لیجئے جو زمان و مکان کے بُعد کے باوجود بالکل ایک ہی طرح کا رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کی دراصل وجہ طبیعی اور نامی عناصر کی یکسانیت ہوتی ہے نہ کہ نقل و اجتماعی جبر کا اثر۔

دوسری بات جس کی ہمیں تحقیق کرنا ہے یہ ہے کہ تارد اور دُرکیم دونوں اجتماعی اور انفرادی حقیقت کا جو فرق بتاتے ہیں آیا واقعی اس کی وہی اہمیت ہے جیسا کہ ان کا خیال ہے؟ بلاشبہ تحقیق کی سہولت کی غرض سے اگر اس فرق کو اجاگر کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر دراصل اس فرق کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئیے۔ اجتماعی زندگی میں انفرادی عناصر کا اثر موجود ہوتا ہے اور اسی طرح سے انفرادی زندگی میں اجتماعی عناصر کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ دراصل انفرادی اور اجتماعی زندگی جہاں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں اس کا تعین بہت دشوار ہے۔ گبریل تارد کی لطافت طبع سے غالباً یہ نازک نکتہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا۔ لیکن ہم اس نکتہ کو ذرا اچھی طرح سے واضح کریں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہر نقالی میں کچھ نہ کچھ ذاتی اپج کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ آپ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی نمونے کی نقل بغیر اصلیت کو اپنی خواہش کے مطابق تھوڑا بہت بگاڑے ہوئے کر سکیں۔ چنانچہ نقل میں بھی ایجاد کا عنصر موجود رہتا ہے۔ اسی طرح ہر موجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسالے سے استفادہ کرے جو پہلے سے موجود ہے اور اس راستے پر چلے جس پر اسکے پیشرو چل چکے ہیں چنانچہ کوئی ایجاد ایسی نہیں ملے گی جس میں تھوڑا بہت نقل کا عنصر نہ پایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس حقیقت کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اگرچہ افراد کے اعمال اجتماعی ضابطوں کے تابع ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی خصوصیات، وسائل اور ان کی ذاتی خواہشوں کو ان اعمال میں بڑا دخل حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر انفرادی عمل کے ڈانڈے آپ کو اجتماعی ضابطوں سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ فی الواقع اجتماعی اور انفرادی عناصر حیات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ انھیں

باب جدا کرنا دشوار ہے ۔ غرضکہ فرد اور جماعت کو ایک دوسرے کی ضد قرار دینا درست نہیں ۔

ہمارے اس نتیجہ کا قدرتی طور پر یہ اثر ہوگا کہ حیات اجتماعی کی تعریف کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائیگی ۔ اور اس کے لئے فرد سے علیحدہ کسی نئے معیار کے قایم کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ لیکن فی الحقیقت ہمارا مطلب یہ تھا کہ کسی طرح سے حقیقت اجتماعی کی ایسی وسیع تعریف کی جائے جو اپنے سب عناصر پر پورے طور پر حاوی ہو ۔ چنانچہ ہمارے خیال میں حقیقت اجتماعی سے وہ اعمال مراد ہیں جو متعدد افراد کے باہمی تعاون سے وجود میں آئیں ۔ اس تعاون کے لئے یہ ضروری نہیں کہ افراد کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہو ۔ اس سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ کوئی انسانی عمل ایک دوسرے کی مدد اور شرکت سے کیا جائے ۔ دو یا دو سے زاید اشخاص جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں ، مل کر کسی مسئلہ کے متعلق غور کرتے ہیں ، یا متحد ہو کر عمل کرتے ہیں ، تو ایسی حالت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے عمل کی نوعیت اجتماعی ہے ۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ باوجود اختلافات کے بھی یہ تعاون عمل باقی رہ سکتا ہے ۔ اسواسطے کہ باوجود اختلافات کے بمقابلہ دوسروں کے انہیں بعض مسائل کی نسبت اشتراک ارادہ پایا جاتا ہے ۔ ہم افراد کے تعاون عمل کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جب تک کہ ان سبھوں کی ایک متحدہ شخصیت رہے ۔ لیکن اگر ان کے اعمال کسی بیرونی اثر کے تابع ہو گئے ہیں تو ایسی حالت میں تعاون عمل بھی مفقود ہو جائے گا ۔ غرضکہ ہمارے خیال میں تو اصلی اجتماعی حقیقت مضمر ہے افراد کے نفسی اتحاد میں ۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے اُس وقت جو اصطلاحیں استعمال کیں وہ بہت زیادہ واضح نہیں ہیں ان کی غرض صرف اتنی ہے کہ بعض حقایق کی اُس وقت تصدیق کی جائے ۔ ہم نے ان اصطلاحوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ

باب ۶

حقایق کی کاٹ چھانٹ کرکے ان کی صورت کو مسخ کردیں۔ ایسے علم کی تعریف کرنا دراصل بہت دشوار ہے جس کا ابھی ابتدائی حالت میں احساس ہو رہا ہو۔ نیز یہ کہ اس تعریف سے معروف خد و خال پیش کئے جائیں۔ لیکن کیا کیجئے منطق کو اس وقت تک اطمینان نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کل پر حاوی نہ ہو جائے اس واسطے کہ وہ کل ہی پر چسپاں ہو سکتی ہے۔

آٹھواں باب

معاشرہ کی حقیقی ماہیت

ہم نے پچھلے باب میں تارد اور دُرکیم کے جس نظری اختلاف کا ذکر کیا وہ پچیس سال قبل اپنی واجبی حدود سے زیادہ آگے بڑھ گیا تھا۔ علمی حلقوں میں اس کے متعلق خوب پُرجوش بحثیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اسی اختلاف کی وجہ سے فرانس کے اہل علم دو ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ دراصل تارد اور دُرکیم کے نظریوں کی تہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلسفۂ اجتماعی کے دو ایسے اصول کارفرما ہیں جو مدتوں سے ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان اصول سے قدرتی طور پر اجتماعی چلن کے جو دو عقاید پیدا ہوتے ہیں وہ صدہا سال سے برسرپیکار رہ چکے ہیں۔ فی الحقیقت تارد انفرادیت پسند تھا۔ اجتماعی زندگی میں اسے ہر کہیں بس یہی نظر آتا تھا کہ بالعموم لوگ اپنے ہم جنسوں کی نقل کرتے ہیں اور کبھی کبھی خود اپنی ذاتی اپج سے بھی کچھ ایجاد کر لیتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس دُرکیم کا عقیدہ تھا کہ جماعت ہر کہیں فرد پر اپنا نقش ثبت کر دیتی ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی "اشتمالی" قسم کی تاویل کرتا تھا۔ ہم یہاں لفظ "اشتمالی" کو سیاسی معنوں میں

نہیں بلکہ خالص علمی معنوں میں استعمال کر رہے ہیں دراصل لفظ "انفرادی"
اور لفظ "اشتمالی" ہمارے علمی مسئلہ کے اس تعلق کو بخوبی واضح
کر دیتے ہیں جو اسے عملی دنیا کے ساتھ قایم رکھنا پڑتا ہے۔ عملی
نقطۂ نظر سے "انفرادی" کا لفظ ان اشخاص پر عاید ہوتا ہے
جو فرد کے حلقۂ عمل کو وسیع کرنے کا قایل ہو۔ اور لفظ "اشتمالی"
ان پر عاید ہوتا ہے جو جماعت کو اس کے عناصر پر ترجیح دیتے ہیں۔
جو لوگ انفرادیت کے قایل ہوتے ہیں۔ وہ ساتھ ہی حریت کے
بھی علمبردار ہوتے ہیں اور وہ جو اشتمالیت کی طرف رجحان رکھتے
ہیں انسانی مساوات کے حامی ہوتے ہیں۔ بلاشبہ مسائل کی علمی
اور عملی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ یہ
صورت ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک کے متعلق اپنی قطعی رائے رکھتا
ہو اور دوسرے کی نسبت اس کی کوئی رائے نہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا
ہے کہ ایک کی نسبت جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ اس سے مختلف
ہو جو دوسرے کی نسبت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن بہرحال اس کا
قوی امکان ہے کہ ایک کے لئے جو حل تسلیم کیا گیا ہے وہ دوسرے
کے لئے بھی تسلیم کیا جائے۔ منطقی اعتبار سے کسی مسئلہ کی علمی نوعیت کو اسکی عملی نوعیت
پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات عملی ضروریات
کا رنگ علمی مسئلہ کے حل پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں
آتی ہے کہ تارد اور درکیم کے اختلاف کو جو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش
کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کے مختلف رجحانوں کے ساتھ
لوگوں نے خود اپنی ذاتی اغراض کو وابستہ کرلیا تھا۔ اسی واسطے تو
اہل علم کی جماعت میں اختلاف اس قدر بڑھ گیا۔ اور واقعہ یہ ہے
کہ اس بحث کو اس قدر طول دینے کی ذمہ داری ان دونوں مفکروں
پر ہرگز نہیں عاید ہوتی۔ دراصل ان دونوں میں کوئی بھی مسائل کی
عملی نوعیت کو اہمیت دینے کا قائل نہ تھا اور خصوصاً درکیم نے

باب ۸

تو اس باب میں ہمیشہ بڑی احتیاط سے کام لیا اور کبھی عملی مسائل کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ چنانچہ اور تحریکوں کی طرح یہاں بھی یہی ہوا کہ قاعدین ان تحریکوں کو وجود میں لانے پر قادر ہوتے ہیں لیکن انھیں روکنا ان کے بس کی بات نہیں۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو دراصل اجتماعی زندگی کی تحقیق کی جان ہے! وہ سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے اعمال میں تصور انفرادی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا تصور اجتماعی کو؟ جسے فلسفہ میں درک ہے وہ اس قسم کے ترجیح دینے ہی کو تعصب سے تعبیر کرے گا۔ اس واسطے کہ پیشتر اس کے کہ ان دونوں میں کسی کو ترجیح دی جائے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا جماعت اپنا علیحدہ وجود رکھتی بھی ہے یا نہیں، اور اگر وہ وجود رکھتی ہے تو اس کی کیا نوعیت ہے؟۔ ظاہر ہے کہ افراد کا مستقل وجود اس قدر بیّن حقیقت ہے کہ اس کے متعلق شبہ کی گنجائش ہی نہیں مگر جماعتیں جو افراد پر مشتمل ہوتی ہیں ان کی حالت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ اول تو اس بات کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ آیا ہم ان جماعتوں کو حقیقی وجود سے تعبیر کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ آیا ان کی قدر و قیمت کا افراد کی قدر و قیمت سے مقابلہ کرکے ان کے باہمی فرق کو ظاہر کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

ہماری رائے میں اس گتھی کو سلجھانے کی یہ صورت ممکن ہے کہ ہم جماعت کی حقیقت کو تو تسلیم کر لیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ہم اسے افراد سے علحدہ ایک مستقل وجود تصور کریں۔ اس طریقہ سے ہم اپنے تئیں دونوں انتہا پسند نظریوں کے حامیوں کے زمرہ سے جدا کر لیتے ہیں۔ خالص انفرادیت کے علمبرداروں سے ہماری یہ عرض ہے کہ الگ الگ افراد کی ہستیوں کے علاوہ اور کسی وجود سے یکسر انکار کرنا سخت غلطی ہے اور اشتمالیوں سے

باب ششم

ہمارا کہنا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا جو ایک نیا بت تم نے بنا کر کھڑا کیا ہے، اسے انسانوں سے علیحدہ اور بالاتر سمجھنا کہاں کی دانائی ہے؟ ان دونوں مسائل کے متعلق ہم ذیل میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔

پہلے تو جماعت کے وجود کی تائید میں جب دعویٰ پیش کیا جائے تو ٹھیک ٹھیک اس امر کی تصریح کر دینی چاہیئے کہ جماعت سے ہماری کیا مراد ہے؟ عالم نباتات وحیوانات میں نوعی زندگی کی حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ بادی النظر میں بنی نوع کو دوسرے حیوانات کے ساتھ مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض بڑے بڑے مفکر تک اس خیال کی تائید کر چکے ہیں۔ پاسکال کا قول مشہور ہے کہ "انسانیت بمنزلہ ایک فرد کے ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہمیشہ سیکھتا رہے گا۔" آگست کونت نے انسانیت کو "ہستی عظمیٰ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق افراد کو چاہیئے کہ انسانیت کو بمنزلہ "مدبر عالم ناسوت" سمجھیں۔ آج یہ وسیع تصور نہیں کسقدر عام معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتحاد انسانیت ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ خواب نسلی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے ابھی تک محتاج تعبیر رہا ہے۔ ماہر عمرانیات انسانیت کو الگ الگ عناصر کی صورت میں دیکھتا ہے اور اکثر اوقات وہ ان عناصر کو ایک دوسرے کی ضد پاتا ہے۔ انسانیت کے ان اجزا کا وجود مختلف اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے جن کی نسبت ہم آگے چلکر تفصیل سے ذکر کریں گے۔ ان میں جنھیں اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہیں: نسل، زبان، مذہب اور قومیت۔ اس وقت ہم آخر الذکر سے بحث کریں گے۔ اقوام کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے شدت سے کوشاں رہتی ہیں۔ چنانچہ ان سب کو عمرانیات میں وہی اہمیت حاصل ہے جو علم حیاتیات میں انواع ذی روح

باب ۳

کو حاصل ہوتی ہے اس علم نے انواع کی بہت بڑی تعداد گنائی ہے اور اقوام کی تعداد مقابلۃً کم ہے۔ ہم صحت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قوم کا اجتماعی تصور حیاتیات کے نوعی تصور سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ چنانچہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بنی نوع انسان کو ایک کل سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

ہاں، ہر قوم میں علیحدہ علیحدہ آپ کو اس کل کی شبیہ نظر آئیگی۔ قومی گروہ بندی کو ایک وحدت اور ایک حقیقت اجتماعی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کئی پہلوؤں سے اقوام اور افراد کے درمیان ایک طرح کی مشابہت نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرد کی طرح ہر قوم کا بھی ایک نام ہوتا ہے، اس کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور اس کی مخصوص نفسی اور مادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر قوم کی ایک علیحدہ ریاست بھی ہوتی ہے اور اس ریاست میں ایک حکومت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ حکومت دراصل ریاست کی ظاہری نمائندگی کرتی ہے۔ بین الاقوامی قانون ہر قوم کی اخلاقی شخصیت کو تسلیم کرتا ہے۔ قوم اور اس کے عناصر یعنی افراد کے باہمی تعلق میں دو باتیں بین طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قوم فرد کی تشکیل کرتی ہے۔ اسے اپنی زبان، اپنے خیالات اور اپنی رسوم سے آشنا کرتی ہے۔ اور تقسیم کار کے اصول کے مطابق جماعتی زندگی میں اس کی جگہ مقرر کرتی ہے۔ قوم ہی کی بدولت فرد کی روزی کا سامان ہوتا ہے اور اس کے عمل کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ افراد مٹ جاتے ہیں مگر قوم باقی رہتی ہے۔ اس کی عمر افراد کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے۔ فرد کی عمر زیادہ سے زیادہ ہوئی تو سو برس مگر اقوام ہزارہا سال تک زندہ رہتی ہیں۔ جس طرح فرد کی زندگی میں پرانے خلیے فنا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیوں سے تجدید حیات

باب ۴

ہوتی رہتی ہے اسی طرح اقوام کی زندگی میں بھی بوڑھے لوگ مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نوجوانوں سے پُر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اقوام آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ افراد کی طرح پیش آتی ہیں۔ جنگ کے موقع پر یہی اقوام مسلح، ہانپتی کانپتی نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے مارے غصّے کے جھاگ نکل رہے ہیں۔ اس موقع پر قوم کے سارے افراد کی حیثیت بمنزلۂ ایک وجود کے ہو جاتی ہے۔ مشترک دشمن کے خلاف سب کے دلوں میں ایک ہی قسم کی اُمنگ موجود ہوتی ہے اور سبھوں کے دلوں میں ایک ہی طرح کی خلش پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضکہ پوری قوم کے جسم میں ایک ہی روح کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ایسے المناک مواقع پر فرد قوم کی خاطر اپنا وقت، اپنے مشاغل، اور اپنی جان تک قربان کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا۔ اس کی جنگ میں شرکت اپنی ذاتی اغراض، اپنے گھر بار یا کسی اپنے محبوب عزیز کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف اپنے وطن کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ وہ سب کچھ بلا کسی امتیاز کے اپنے وطن کے لئے کرتا ہے۔ اگر وطن کی اعلیٰ حقیقت نے اس کے دل میں جگہ نہ کر لی ہوتی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ تج دے۔

ہم نے یہ جو واقعات بیان کئے ہیں حقایق پر مبنی ہیں۔ انھیں جیسا چاہئے ویسے نہ سمجھنا یا ان کی طرف سے چشم پوشی کرنا نادانی ہوگی۔ اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی جانب ہمیں توجہ کرنی چاہئے۔ دراصل سارے انسانی معاملوں کی یہ کیفیت ہے کہ آپ انھیں مختلف پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں جس طرح ہر کپڑے اور تمغہ کا اُلٹا سیدھا ہوا کرتا ہے اسی طرح سارے انسانی اعمال کے بھی جن میں معاشرہ کو سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا

باب　چاہیئے، دو رخ ہوا کرتے ہیں۔ اور باوجود اختلاف کے ان دونوں رخوں میں ایک طرح کا تعلق موجود ہوتا ہے۔ دراصل یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی کافی بالذات نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہیگل نے ثابت کیا ہے کہ متضاد اشیا میں مماثلت موجود ہوتی ہے۔ ہم شاید اپنے دعوی کو اتنا زیادہ بڑھا کر تو نہیں بیان کریں گے مگر ہاں، ہم بھی متضاد اشیاء میں ایک طرح کے ربط کے ضرور قایل ہیں۔ چنانچہ ہم نے ابھی ابھی حقیقت اجتماعی کی نسبت جو ذکر کیا تو اس میں بھی اسی طرح ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آتی جس کی بنا پر ہم اسے اور فرد کو ایک دوسرے سے علیحدہ، آزاد وجود تسلیم کریں۔ بعینہ یہی حال ریاست کا ہے۔ ریاست کوئی پُر اسرار ہستی نہیں ہے جیسا کہ بعض المانی مصنفین نے اسے پیش کیا ہے۔ ان مصنفین کے ہاں حقایق کی صحت کا زیادہ التزام نہیں برتا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ریاست کو افراد سے ماوری تسلیم کیا ہے یہاں تک کہ وہ اُن کے تعاون عمل سے بھی بے نیاز ہے۔ مگر فرانسیسی ذہن کی شفاف روشنی کے سامنے اس قسم کی تاریک خیال آرائیاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتیں۔ یہاں ہم آپ کو اُن تصورات کے نتایج سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس واسطے کہ ڈرکیم کی بعض اصطلاحوں کے ہمارے ملک میں رائج ہونے سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی اس قسم کے تصورات کو قبول کر لیا گیا۔ یہ بات پورے طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ معاشرہ کا افراد سے ماوری کوئی وجود نہیں۔ دراصل جسم اجتماعی کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے صرف شہریوں کی مجموعی حالت مراد ہوتی ہے۔ جب نفس اجتماعی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے افراد کی وہ ذہنی حالت مراد ہوتی ہے جس سے ان کے خیالات و

باب

جذبات میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ جماعت دراصل عبارت ہوتی ہے جماعت کے ارکان سے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جماعتی زندگی کا مقصد افراد کی زندگی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ جب یہ دعویٰ پیش کیا جاتا ہے کہ شہری کو ریاست کیلئے جینا چاہیئے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے لئے کام کرنا چاہیئے اور یہ کہ ہر فرد بشر کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی تابعداری کرے۔ پہلا خیال ممکن ہے اخلاقی حیثیت سے بہت اچھا ہو مگر اس وقت اسے عمل میں لانا ممکن نہ ہوگا جب تک کہ اس میں اصولی تبدیلی نہ کرلی جائے۔ ممکن ہے دوسرا خیال ان ممالک میں مقبول ہو جائے۔ جہاں شاہی طرز حکومت رائج ہے اور بادشاہ کو وطنیت کے اوتار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں جمہوریت کی فرمانروائی ہے۔ وہاں اس کے بالکل برعکس حکومتوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے محکوموں کی خدمت کریں۔ اس واسطے کہ جمہوری اصول کے مطابق حکومت افراد کی بعض ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آتی ہے۔ جمہوری حکومتوں میں حکمرانوں کو جو مراعات حاصل ہوتی ہیں ان کے حدود عام شہریوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے متعین کردئیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرد کے حقوق ہمیشہ ریاست اور حکومت کے حقوق کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ یہ حقوق آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہوتے ہیں جیسے کسی ایک شئے کے دو رخ۔ ان سے تمدنی زندگی کا توازن برقرار رہتا ہے اور دراصل ان کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

یہ حقوق خود حقیقت اجتماعی کا پرتو ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض وقت ان میں تضاد واقع ہو جائے مگر وہ رہتے ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرد اور

باب ۳

جماعت مثل ان حقایق کے ہیں جو ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کیے جا سکتے ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ جماعت کو محض تجرید سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے وجود کا افراد کے وجود پر تمامتر مدار ہوتا ہے۔ اب ان دونوں دعوؤں کی صداقت کی جانچ باقی ہے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ ہم اس امر کو تسلیم کریں کہ حیات اجتماعی فی الحقیقت افراد کی تنظیم کا دوسرا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس تنظیم سے بجائے خود حیات انفرادی کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر ہم فرد اور جماعت کے حقائق پر اس نقطۂ نظر سے غور کریں تو اکثر متضاد خیالات میں موافقت کی شکل نکل سکتی ہے ممکن ہے کہ ہمیں اس تصور کو صحت سے پیش کرنے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ آئندہ ابواب میں ہم یہی کریں گے۔

نواں باب

معاہدۂ عمرانی یا جسم اجتماعی

اب سوال یہ ہے کہ ہم جماعت کو افراد کی تنظیم سے کیونکر تعبیر کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے بہت سارے جواب دیئے جا چکے ہیں۔ اس باب میں خاصکر دو خیال بہت مقبول ہوئے۔ ان دونوں سے وہ نظام مراد ہیں جن کے لئے "نظریۂ معاہدۂ عمرانی" اور "نظریۂ جسم اجتماعی" کی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ ان دونوں نظریوں میں مفاہمت پیدا کی جا سکتی ہے۔

"نظریۂ معاہدۂ عمرانی" جب پہلے پہل پیش کیا گیا تو واقعی پہلے کے نظریوں کے بہ نسبت اس میں زیادہ وسعت نظر آتی تھی۔ اس نظریہ کے وجود میں آنے سے قبل اجتماعی زندگی کے متعلق جو خیالات رائج تھے وہ سب کے سب اصولاً ربط عمرانی کو اقتدار و تحکم کے تابع قرار دیتے تھے۔ اور اس اقتدار کا تصور یہ تھا کہ وہ مادی قوت اور وراثت پر مبنی ہوتا ہے یا عالم محسوسات سے بالاتر مشیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس "نظریۂ معاہدۂ عمرانی" نے یہ ثابت کر دیا کہ افراد کے باہمی ربط و تعلق میں ان کے ارادے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس نظریہ سے حیات عمرانی

باب ۹

افراد کے باہمی تعاون عمل کا نتیجہ قرار پائی جسے انھوں نے خود اپنی مرضی سے نہ کہ کسی کے جبر سے اختیار کیا۔ چنانچہ اس نظریہ نے اپنی ابتدا ہی فرد انسانی کی آزادی کے اصول سے کی اور اس کے مطابق حیات اجتماعی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس کی آزادی کو برقرار و مستحکم کرے۔ سب سے پہلے اس نظریہ کو مختصر طور پر اسپینوزا نے پیش کیا تھا پھر اس کے بعد روسو کی خطابت نے اس کی حمایت میں اپنا سارا زور صرف کیا۔ کانٹ کے ہاں بھی یہ نظریہ آپ کو ملے گا۔ پھر اسی نظریہ کی تعلیم کے اثر سے انسان اور شہری کے حقوق کا نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کیا گیا۔ فرانس کی جمہوریت کا دستور اساسی اور موجودہ لبرل ازم کی تحریک اسی نظریہ پر مبنی ہیں۔

عملی اصول کی حیثیت سے اس نظریہ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن تاریخی تاویل کے اعتبار سے اسے ٹھیک نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ جس زمانہ میں اس نظریہ کو منظر عام پر لایا گیا اس زمانہ میں تاریخی صحت کا التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خود روسو نے اسے محض اصول موضوعہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانی" کے پہلے باب میں یہ بات بطور مفروضہ بیان کی ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عہد ایسا بھی گزرا ہے جب کہ انسان "فطری حالت" میں زندگی بسر کرتا تھا اور سب لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔ خود روسو کو اپنے اس دعوے کی صداقت پر پوری طرح اعتماد نہ تھا۔ آج ہمارے زمانہ میں شاید ہی کوئی ہو جو اس قسم کے نظریئے کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ ہمارے زمانہ میں اس دعوے کو بے بنیاد قرار دیا جائے گا کہ انسانوں پر ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے کہ جب کہ وہ حیات اجتماعی سے ناآشنا

تھے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ غالباً شاید ہی کبھی لوگوں نے اس دعوے کو تسلیم کیا ہو۔ ہمارے زمانہ میں تو معاشرہ کو اصل حقیقت خیال کیا جاتا ہے نہ کہ حقیقت ماخوذ۔

چنانچہ آج کل جو نظریہ بہت مقبول ہے وہ مذکورۂ بالا اصول پر مبنی ہے۔ اسے "نظریۂ جسم اجتماعی" کہتے ہیں۔ دراصل یہ نظریہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ قدما کے ہاں اور ازمنۂ وسطیٰ میں ہمیں اس کے متعلق ذکر ملتا ہے[1]۔ انیسویں صدی عیسوی میں یہ نظریہ باقاعدہ علمی شکل میں پیش کیا گیا۔ آگسٹ کونٹ کے ہاں بھی ہمیں "اجتماعی جسم نامی" کے خیال کا ذکر ملتا ہے۔ ہاں، اس نے اس اصطلاح کو اپنے مخصوص معنی میں استعمال کیا ہے[2]۔ ہربرٹ اسپنسر لفظی چکر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے اپنی کتاب "اصول عمرانیات" میں اس نظریہ پر بحث کی ہے۔ اور اس کے خیالات کا چربہ اور دوسرے ملکوں کے علمائے عمرانیات نے اتارا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں روسی علمائے عمرانیات ژاک نووی کو[3] اور پال دے للین فیلا[4] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر مشہور المانی مصنف البرٹ شافل نے اس نظریہ کو تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب[5]

---

[1] دیکھو لڈوگ اسٹین کی کتاب "ریاست کے میکانکی اور نامی تصورات" نیز دیکھو ۱۹۱۱ء کا "عمرانیات کا بین الاقوامی رسالہ"۔

[2] دیکھو "نظام سیاست ایجابی" جلد ۲۔ باب ۵۔

[3] دیکھو اس کی کتاب "نفس انسانی اور ارادۂ اجتماعی"۔

[4] "مستقبل کے علم عمرانی پر چند خیالات" روسی اور جرمن زبان میں شایع ہو چکی ہیں اور "امراض اجتماعی کی تشخیص" فرانسیسی میں شایع ہوئی ہے۔

[5] Bau und Leben des sozialen Kaespers

باب ۹

کی تمہید ہی میں اس کی تصریح کردی ہے کہ معاشرہ مثل ایک تنظیم کے ہے نہ کہ بہ منزلہ عضو نامی۔ فرانس میں اجتماعی جسم نامی کے نظریئے کو اس لئے خوب فروغ نصیب ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ اور اس کی تہ میں اجتماعی ذمہ داری کا خیال مقبول ہو چکا تھا۔ آج ہمارے زمانہ میں بھی یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ انھیں جدا کرنا بہت دشوار ہے۔ بظاہر اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں نظر آتی مگر بہرحال یہ ایک امر واقعہ ہے[1]۔

اس نظریہ کے متبعین کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں کبھی ایسا کوئی دن نہیں آیا جب کہ خاصکر کے لوگوں نے تشکیل اجتماعی پر غور کیا ہو۔ بلکہ اجتماعی زندگی سے انسان ہمیشہ سے واقف ہے۔ ارسطو کے مشہور مقولہ کے موافق انسان ایک جماعت پسند حیوان ہے۔ معاشرہ انسان کا ہمیشہ سے فطری ماحول رہا ہے۔ اور اس نے قدیم سے اسی ماحول میں اپنی زندگی بسر کی۔ جسم اجتماعی میں انسان کی حیثیت بمنزلہ ایک خلیہ کے ہے۔ اجتماعی جسم میں افراد کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو کسی شخص کے جسم میں جاندار خلیوں کی ہوتی ہے۔ جسم اجتماعی کے خلیے بھی بڑھ کر رگ و پے اور اعضاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انفرادی جسم کی طرح اجتماعی جسم میں بھی یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ خوراک کو جزو بدن بنائے، تخلیق حیات کرے، اور ربط و تعلق کی زندگی بسر کرے۔ جسم اجتماعی تطابق، توارث اور انتخاب اصلح کے اصول پر بھی عمل کرتا ہے۔ انفرادی جسم کے مثل اجتماعی جسم کو بھی بیماریاں لاحق ہوا کرتی ہیں وہ بھی جوکھوں سے گزرتے ہیں اور انھیں بھی پیدائش، بچپن،

---

[1] لیون بورجوا کی کتاب "اجتماعی ذمہ داری"۔

جوانی اور پھر زوال و موت کے مختلف دوروں سے دو چار ہونا پڑتا ہے ۔ جس طرح مجموعی طور پر فرد و جماعت میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے اسی طرح ان کے عناصر مشتملہ میں بھی مشابہت موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جسم انفرادی اور جسم اجتماعی کی اس باہمی مشابہت کے متعلق خود ہمارا کیا خیال ہے ۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر بعض باتوں میں یہ مشابہت اس قدر صریح ہے کہ اس کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مثال کے طور پر تقسیم کار کے اصول کو لیجئے ۔ اس اصول کی کار فرمائی آپ کو جاندار جسم کے مختلف حصوں میں اسی طرح نظر آئے گی جس طرح معاشرہ میں اسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے باعث جسم انفرادی کے وظائف میں تبادلۂ خدمات اور تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے اور مختلف حصوں کے اسی باہمی تعاون و تعامل کی بدولت ایک قسم کی ناگزیر وحدت پیدا ہو جاتی ہے ۔ پھر یہی تبادلۂ خدمات اور تعاون معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں ارادی نوعیت اختیار کر لیتا ہے ۔ چنانچہ اس انسانی ارادہ اور فکر کی بنیاد پر اخلاق کی عمارت استوار کی جاتی ہے ۔ فرد اور جماعت کی اس عام مشابہت کے علاوہ بعض باتوں میں یہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے بعض واقعات حیات نامی کے بعض مظاہر کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ مثلاً معاشرہ میں تقسیم دولت اور انسانی جسم کے دوران خون میں مشابہت ملتی ہے۔ اسپنسر تو یہاں تک کہتا ہے کہ جسم کے اعصاب اور برقی تاروں میں بھی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ یہ مشابہت چاہے کتنی ہی بین کیوں نہ ہو مگر ہمارے خیال میں یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں زیادہ قدم آگے نہ بڑھایا جائے۔

باب ۹

اس لئے کہ اگر یہاں ہم نہ رُکے تو یہ علمی مشابہت محض ایک استعارہ ہو کر رہ جائے۔

اس بحث میں ہم اس عام نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اجتماعی طریقِ عمل کی بنا اور اس کا نمونہ ایک حد تک ہمیں حیات نامی میں ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعلق بہت دور کا ہو۔ معاشرے بھی اجسام نامی کے مثل جاندار فطرت کے اجزا ہیں۔ چنانچہ دونوں پر ایک ہی نوعیت کے عام قوانین عاید ہوتے ہیں۔ حیاتیات میں حیات نامی کے تنظیم و عمل کے جن طریقوں کی تحقیق کی جاتی ہے وہ سب عمرانیات کے تحت میں بھی آتے ہیں۔ مگر عمرانیات میں وہ اور بھی زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی خیال اور ارادہ کی کارفرمائی سے اس بحث میں اور دوسرے نئے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ ان انسانی ارادوں نے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں ہمیشہ نئے نئے روپ اختیار کئے ہیں۔ فطرت کی ساری قوتوں میں ان سے زیادہ پیچیدہ اور کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ انسان کے دوران خون کی کیفیت کو ایک سادہ اور ناقابل تغیر شکل کھینچ کر ظاہر کرنا آسان ہے۔ مگر معاشرہ میں تقسیم دولت کی کیفیت کسی ترسیمی شکل سے مشاہدہ نہیں کیجا سکتی۔ اگر آپ تقسیم دولت کو ایک شکل کھینچ کر بتلانا چاہیں تو آپ کو بڑی کاٹ چھانٹ کرنا پڑے گی اور ہر دس سال کے بعد اس شکل کے خطوط میں تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ چنانچہ ترسیمی اشکال کھینچ کر معاشی زندگی کے حقایق کا مشاہدہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ معاشیات عضویات کے مقابلہ میں ایک نامکمل علم ہے اور اس میں صحت بھی کم پائی جاتی ہے۔

باب ۹

یہ سچ ہے کہ انسان اپنے تخلیقی اعمال میں فطرت سے اثر پذیر ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ فطرت سے اور دو قدم آگے بڑھنا بھی جانتا ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہمارے سارے اوزار و آلات ان صورتوں کو دیکھکر بنائے گئے ہوں گے جو ابتدائی انسانوں نے اپنے گردوپیش میں دیکھی ہوں گی مگر ساتھ ہی ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ اس تخلیقی عمل میں ان کی اپنی اپج اور جدت طرازی کو بھی بڑا دخل ہوگا۔ یہ مانا کہ کھانے کا کانٹا ہاتھ کے انگلیوں کی نقل ہے اور ہوا باز کے پنکھ چڑیوں کے پروں کی نقل ہیں مگر ان کی تکمیل انسانی جودت طبع کی رہین منت ہے۔ ہمیں آج اس کا مشکل ہی سے اندازہ ہوسکے گا کہ ان دونوں مذکورہ ایجادوں کے لئے انسانوں نے صدہا سال تک کیا کیا سعی وجہد کے طریقے اختیار کئے اور اپنی عقل وذہانت صرف کی۔ عام طور پر سارے انسانی اعمال کا یہی حال ہے۔ اس کی حیات اجتماعی کی تنظیم کو لیجئے۔ اس کی ابتدا فطرت کے تنگ اور بے تکلف آغوش میں ہوئی۔ ہزارہا سال کی متواتر سعی وعمل کے بعد معاشرہ اپنے اس اعلیٰ مرتبہ تک پہونچا ہے جہاں ہم آج اسے پاتے ہیں۔ آج ہماری اجتماعی زندگی صدیوں کے اختراعی نتائج کی حامل ہے جن کی بدولت تہذیب انسانی کی عظیم الشان اور وسیع عمارت تیار ہوئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس عمارت کی شان و شوکت ہی میں اس کی کمزوری مضمر ہے۔

ایک اور نقطۂ نظر سے ہم اس عمارت کو عضو نامی سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ انسان نے اپنی مختلف اور متواتر ذہنی سعی وجہد سے اس پر قابو حاصل کیا اور اسے اپنی ضروریات

باب ۹

کے لئے استعمال کیا اور اسے ترقی دی۔ اسپیناس نے اسی خیال کو کس قدر دل نشین انداز میں بیان کیا ہے کہ معاشرہ کو "تصورات و افکار کے عضو" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے اسپنسر نے بھی معاشرہ کی اس خصوصیت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس خصوصیت سے انکار کرنا بہت دشوار بات ہے۔ اسپنسر جب کبھی معاشرہ کو عضو نامی سے تشبیہ دیتا ہے تو اسے "عضو مافوقی" سے تعبیر کرتا ہے۔

اس بحث سے، جیسا کہ اس باب کے شروع میں ہم نے کہا تھا، ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نظریۂ "جسم اجتماعی" اور نظریۂ "معاہدہ عمرانی" کے بنیادی تصورات میں ایک قسم کی مفاہمت ممکن ہے۔ ایک مشترک عنصر ایسا ہے جو اپنی پوری صحت کے ساتھ دونوں میں ملتا ہے۔ یہ دونوں نظریے حقیقت کے دو مختلف رخوں کی پردہ کشائی کرتے ہیں۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے اندر ضم کر دیں یا ایک کو دوسرے کے اوپر چسپاں کر دیں۔ دراصل نظریہ "جسم اجتماعی" معاشرہ کے آغاز سے بحث کرتا ہے اور نظریۂ "معاہدہ عمرانی" معاشرہ کی اس حالت سے بحث کرتا ہے جو اس نے بعد میں اختیار کر لی ہیں یہ بات پورے طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معاشرہ بھی تقریباً اسی طرح سے عالم وجود میں آتا ہے جس طرح کہ اجسام نامی۔ اور اس کی تنظیم بھی انھیں قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ جن کے مطابق زندگی میں نظم و ترتیب پیدا ہوتی ہے۔ پھر معاشروں کا نشو و نما اور ان کی ترقی میں انسانی سعی کو بڑا دخل ہے۔ معاشرے ایک ایسے مقاصد کے حصول میں

باب ۴

سرگرم تگاپو ہو جاتے ہیں جنھیں فی الواقع خود نفس انسانی نے متعین کیا ہے۔ مثلاً انصاف، امن، آزادی اور علم کے نصب العین انھیں مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھکر معاشرہ اپنے ارکان کے درمیان مساوات اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن کی خاطر دراصل اس نے یہ معاہدہ کیا۔ چنانچہ اس طریقہ پر معاشرہ "عالم نامی" کی ایک ایک منزل طے کر کے عالم عمرانی میں قدم رکھتا ہے۔ یہ سب کچھ ایسا غیر محسوس طور پر عمل میں آتا ہے کہ نہ دھچکے لگتے ہیں اور نہ وقفے پیدا ہوتے ہیں۔ نفس انسانی خود بخود چپ چاپ یہ سارا کام انجام دیتا ہے۔ الفرد فوئیے[1] کا قول ہے کہ ہمارے زمانہ کے تصورات وخواہشات کے مطابق معاشرہ کو "جسم معاہدی"[2] کہنا درست ہوگا۔ اس اصول موضوعہ کی دونوں مصطلحات میں تصور ارتقا کی بدولت وحدت معنوی پیدا ہو گئی ہے[3]۔

---

[1] ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب "موجودہ عہد میں علم عمرانیات۔"

[2] یعنی ایک ایسا جسم جو "اعضا" کے باہمی عہد وپیمان سے پیدا ہوا ہو۔

[3] ہم نے اپنی تصنیف "جسم اور معاشرہ" میں نظریہ "جسم اجتماعی" کے اصول کا تتبع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں شایع ہو چکی ہے اس کے بعد تحقیق، تجربہ و مشاہدہ اور غور وفکر سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمارے خیالات میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور ہم نے اپنی ابتدائی تحقیق میں جن اصول کی رہبری میں کام کیا تھا اب ضرورت اس کی ہے کہ ان کی جگہ دوسرے اصولوں کو تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنی بعد کی تصنیفات میں اپنے نتایج و اصول کے تعین میں پوری احتیاط برتی ہے۔ ملاحظہ ہو ہماری تصنیف "علوم عمرانی کا فلسفہ" کی تینوں جلدیں۔ (پہلا اڈیشن ۱۹۰۳ء۔ ۱۹۰۷ء، اور دوسرا ۱۹۱۳ء۔ ۱۹۲۰ء) - اور ہماری کتاب "ارتقائے اجتماعی کے حیاتیاتی اصول" مطبوعہ ۱۹۱۰ء۔ اس کے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

دسواں باب

علم عمرانیات کی تقسیم اگر ہم معاشرہ کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے جسم نامی سے مشابہ سمجھتے ہیں تو ضرور ہے کہ اس کی تحقیق اور علوم طبیعی کے تحقیق و مشاہدہ میں ایک طرح کی مناسبت موجود ہو علوم طبیعی اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ہم ان کی روشنی اور بصیرت سے عمرانیات کو بہت کچھ مستفیض کر سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کرنا ممکن ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔ اول تو یہ کہ علوم طبیعی کے مشاہدات کی بدولت ہم عمرانیات کے موضوع کی ٹھیک ٹھیک تقسیم کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم عمرانیات کے طریقۂ تحقیق کو متعین کر سکتے ہیں اس باب میں ہم عمرانیات کے موضوع کی تقسیم کے متعلق کچھ عرض کر دیں۔

عمرانیات کے موضوع بحث کی تقسیم کا مسئلہ سب سے پہلے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- علاوہ اس کتاب کے آیندہ ابواب میں بھی ہمارا نقطۂ نظر یہی رہا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اپنی ابتدائی کتاب "جسم اور معاشرہ" کو دوبارہ طبع کرائیں اور اسمیں سے وہ حصہ نکال دیں جسے ہم اب غلط سمجھتے ہیں اور اس کے باقی رہنے والے عناصر کی پورے طور پر تصریح کر دیں۔

باب ۱

اس علم کے بانی آگست کونت نے چھیڑا تھا۔ اس مسئلہ کا بہترین حل اسے اس میں نظر آیا کہ عمرانیات اور میکانک[1] میں تعلق پیدا کرنا چاہئے۔ اس کا یہ کہنا اس لئے ٹھیک تھا کہ وہ عمرانیات کو "طبیعیات اجتماعی" سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے عمرانیات کے دو حصے قرار دیئے ہیں۔ سکونی عمرانیات اور حرکتی عمرانیات اس نے اپنی کتاب "فلسفۂ ایجابی کے اسباق" میں چھ جلدوں میں سے پوری تین جلدوں میں نفس عمرانیات پر بحث کی ہے، چوتھی جلد میں سکونی عمرانیات اور پانچویں اور چھٹی جلد میں حرکتی عمرانیات کے مسایل کو پیش کیا ہے۔ اپنی ایک اور دوسری کتاب "نظام سیاست ایجابی" میں دوسری جلد میں سکونی عمرانیات اور تیسری جلد میں حرکتی عمرانیات کے مسائل سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب کل چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آگست کونت کے نظریہ کے مطابق سکونی عمرانیات کا موضوع بحث معاشرہ کی تنظیم ہے اور حرکتی عمرانیات انسانی ارتقا سے بحث کرتی ہے۔ اول الذکر معاشرہ کے عناصر پایندہ کا مشاہدہ کرتی ہے اور آخر الذکر اس کے تغیر پذیر عناصر کی تحقیق کرتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ عمرانیات کی اس قسم کی تقسیم میکانک اور علم الحیات کی تقسیموں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ اس کے نزدیک عضویات اور سکونیات میں وہی مناسبت ہے جو عضویات اور علم الحرکت میں ہے۔ ہماری رائے میں آگست کونت نے ان مسائل کی تصریح میں غلطی کی ہے۔ یہ غلطی ایسی بدیہی ہے کہ ہم ابھی آگے چلکر اسے مفصل بیان کریں گے۔

---

[1] Mechanics

باب۱

پہلے ہمیں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسکے خیالات میں ہماری رہنمائی کے لئے کون کون سی باتیں ہیں -

آگست کونت کے نظام خیال میں سب سے زیادہ دلچسپ یہ نکتہ ہے کہ ہم معاشرتی زندگی کا مشاہدہ حالت سکون اور حالت حرکت میں کر سکتے ہیں - اس تصور کو آج بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی کہ خود اس کے زمانہ میں تھی - اگر ہم معاشرہ کا سکونی حالت میں مشاہدہ کرنا چاہیں تو ہمارا مشاہدہ فی الحقیقت ایک مخصوص زمانہ تک محدود رہیگا اور اگر ہم اس کا حالت حرکت میں مشاہدہ کرنا چاہیں تو لازم ہے کہ ہم اس کی ان گوناگوں حالتوں کی تحقیق کریں جو وہ مختلف زمانوں میں اختیار کرتا رہتا ہے - چنانچہ اگر ہم فرانس کے معاشرہ کے متعلق معلومات جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ممکن ہیں - ایک یہ کہ ہم اپنی تحقیق کی خاطر کسی ایسی محدود شئے کو لیں جو بآسانی ہماری گرفت میں آسکے جیسے نورمنڈی یا گاسکون کے علاقوں کی معاشرتی زندگی یا یہ کہ ہم مجسٹریٹی کے ادارہ یا صیغۂ تعلیم کی نسبت تحقیق کریں - آخر الذکر تحقیق میں ہم اپنے پیش نظر اجتماعی وظائف کے نقطۂ نظر کو رکھیں گے - ہمیں اختیار ہو گا کہ ہم کسی محدود یا وسیع ادارہ کی موجودہ حالت کی نسبت پوری تفصیل کے ساتھ معلومات جمع کرلیں - ہماری اس تحقیق کا تعلق سکونی عمرانیات سے ہو گا - اس کے برعکس ہم کسی ادارہ کی تاریخی تحقیق بھی کرسکتے ہیں - یعنی اس کی ابتدائی حالت کی چھان بین کریں - اور یہ دیکھیں کہ اس نے کون کون سی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور پھر یہ کہ اس کی اب موجودہ حالت کیا ہے - اس قسم کی تحقیق کا تعلق حرکتی عمرانیات سے ہو گا - تحقیق و مشاہدہ کے

باب

یہ دونوں طریقے مساوی طور پر درست ہیں ان دونوں طریقوں میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ لیکن ان دونوں میں کوئی ایک بھی پورے طور پر حقیقت کے چہرہ کی نقاب کشائی نہیں کرتا۔ ہاں دونوں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ نکتہ کبھی نہیں فراموش کرنا چاہیئے کہ یا تو تحقیق کرتے وقت ان دونوں کو ملا لینا چاہیئے یا یہ کہ انھیں الگ الگ باری باری سے استعمال کرنا چاہیئے۔ آگست کونت اس نکتہ کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ اس کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس کی تصریح کی۔

اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری رائے آگست کونت کی رائے سے مختلف ہے۔ اول تو یہ کہ اس نے نفس اجتماعی کی سکونی حالت کو اس کی حرکتی حالت پر بلا ضرورت بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کے انداز تحریر سے ایسا ترشح ہوتا ہے جیسے معاشرے کی مستحکم اور ناقابل تغیر نظام کے پابند ہوں اور ان کی مسلسل حرکت کے باوجود ان کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لیتیں۔ دراصل ہمیں اس میں شبہ ہے کہ آیا اس قسم کا کوئی نظام واقعی موجود ہے یا نہیں۔ عہد حاضر کے علمائے عمرانیات کے نزدیک ارتقار ایک عظیم الشان حقیقت ہے جس سے اجتماعی زندگی کو بھی مفر نہیں اور جس کے مطابق ہر لحظہ اس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں حیات اجتماعی کی رفتار ارتقا کا رک جانا مستثنیات میں سے ہے۔ اور بعض تو غالباً اسے محض فریب نظر سے تعبیر کریں گے۔ اس لئے کہ ہم میں سے اکثر اس حالت کو حرکت کے فقدان سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ

ہمارے حواس یا ہمارے نفس پر اس کے عمل کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی کیفیت محض موضوعی وجود رکھتی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ حرکت ایک دائمی چیز ہے۔ اب اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اجتماعی زندگی کے سب بڑے بڑے مسائل کا حل ہمیں حرکتی عمرانیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں سکونی عمرانیات کی حیثیت نفس بشری کے ایک سہل العمل طریقہ تحقیق سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ حرکتی عمرانیات کی رو سے ہم حیات اجتماعی کا صرف ایک تصور قایم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ معاشرہ کی حالت ایک لمحہ قبل کچھ اور تھی اور ایک لمحہ بعد کچھ اور ہو جائے گی۔ ہر لمحہ وہ نت نئے روپ اختیار کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کے تصور کی حیثیت محض وقتی اور عارضی ہو گی۔ ممکن ہے کہ یہ تصور بالکل درست ہو اور اسی وجہ سے غالباً ہمارے واسطے بصیرت افروز ہو گا مگر اس کی وساطت سے ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نہایت محدود اور عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور علم ایک ایسی چیز ہے جسے سب کچھ گوارا ہے مگر یہ کبھی گوارا نہیں ہو سکتا کہ اسے عارضی سمجھا جائے۔

اس کے علاوہ آگست کونت کے اصول تقسیم میں اور دوسری غلطیاں بھی ہیں۔ اول یہ کہ اس نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ بہت ناقص ہیں۔ ان سے غیر صحیح تصورات کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ دراصل کونت کی تمامتر کوشش کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عمرانیات اور میکانک کو پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے عمرانیات کو سکونی اور حرکتی میں تقسیم کیا۔ مگر خود میکانک کی

تقسیم تین حصّوں میں کی گئی ہے، سکونی، حرکتی اور کمائی۔ خالص حرکت دراصل علم الحرکت[1] کا موضوع بحث ہے نہ کہ حرکتی میکانک کا۔ ظاہر ہے کہ کونت چونکہ خود بہت بڑا ریاضی داں تھا اس لئے وہ ان ابتدائی تصورات سے بے خبر نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ پیرس کے مدرسہ پولی ٹیکنک میں تجزیہ و میکانک کے استاد کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ چنانچہ اس پر ہمیں خود تعجب ہے کہ حیات اجتماعی کی حرکت کے واسطے بجائے علم الحرکت کے حرکتی عمرانیات کی اصطلاح کیوں استعمال کی۔ اسے یہ بات معلوم ہونی چاہئے تھی کہ ان اصطلاحوں کے مروجہ معنوں کی وجہ سے اس باب میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا قوی احتمال ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی یہ کہ میکانک عمرانی کے تین عناصر دو میں ضم ہو گئے۔ اس طرح اس نے عمرانیات جیسے پیچیدہ علم میں ایک اصطلاح کی تخفیف کر دی حالانکہ اگر یہ اصطلاح غیر ضروری ہوتی تو پہلے خود میکانک جیسا سادہ علم اس کو غیر ضروری جان کر کیوں نہ ترک کر دیتا۔ دراصل آگست کونت کے ایسا کرنے کی وجہ دوسری غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس کی نسبت ہم ابھی کچھ عرض کرتے ہیں۔

آگست کونت کی اس دوسری غلط فہمی کی تفصیل یہ ہے کہ اس نے میکانک اور علم حیات کی عام تقسیم کے اصول کو آپس میں گڈمڈ کر دیا۔ علم حیات کو علم تشریح اور عضویات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کونت کو یہ دھوکا ہوا کہ حیات اجتماعی میں بھی سکونی عمرانیات کی حیثیت علم تشریح کی سی ہے اور

---

[1] Kinematics (علم الحرکت) خالص حرکت سے بحث کرتی ہے اور Dynamics (حرکیات) میں حرکت اور وہ قوت جس سے حرکت پیدا ہوتی ہے، دونوں کی تحقیق کی جاتی ہے۔

باب

حرکتی عمرانیات کی عضویات کی لیکن حرکتی عمرانیات کا اس نے جو تصور پیش کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے غرضکہ ایک عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تشریح اعضاء کی ساخت کا علم ہے اور عضویات ان کے افعال و وظایف کی تحقیق کرتی ہے۔ اور کونت کے نزدیک سکونی عمرانیات اجتماعی زندگی کی اس حالت سے بحث کرتی ہے جب کہ وہ عالم جمود میں ہو اور حرکتی عمرانیات اس کے نت نئے تغیرات کا جائزہ لیتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تشبیہ کو واضح کرنے کے لئے کہتا ہے کہ علم تشریح بھی اعضاء کی سکونی حالت سے بحث کرتا ہے اور عضویات ان کی متحرک حالت کو پیش کرتی ہے۔ یعنی جس وقت ان سے افعال ظہور پذیر ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ذرا عمیق نظر سے دیکھا جائے تو اس میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ اعضاء کی حرکت سے مراد ان کے معمولی وظائف ہی نہیں بلکہ وہ تغیرات بھی ہیں جو ان وظایف کی بدولت ان کی ظاہری صورت میں تکوین پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے ارتقاء کا یہی مطلب ہے۔ کونت نے حرکت کا لفظ جہاں استعمال کیا ہے یعنی Kinematics کے معنی میں اس کے لحاظ سے ذی روح اجسام کی حرکت ان کی ارتقائی حالت سے جداگانہ سمجھنا چاہیئے۔ اب رہا عضویات اور علم تشریح کے موضوع بحث کی نسبت کوئی فیصلہ کرنا تو ایک اعتبار سے یہ درست ہے کہ عضویات میں بھی سکونی حالت کا اسی قدر لحاظ رکھنا پڑتا ہے جتنا کہ علم تشریح میں۔ عضویات بھی علم تشریح کی طرح ایک متعین وقت میں اعضاء کے وظائف کا تجربہ مشاہدہ کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علم تشریح ایک معین

باب ۴

وقت میں اعضا کی حالت کی تحقیق کرتی ہے[1]۔
تعجب ہے کہ باوجود علم حیات میں کامل دستگاہ رکھنے کے آگسٹ کونت نے یہ تجزیہ اس قدر سادہ اصول پر کیا۔ نہ معلوم اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ وظائف اعضاء کی سکونی حالت اور ان کے بیہم تغیر کی متحرک کیفیت میں فرق ہے۔ اول تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ معمولی وظائف اعضا اور ان کے تغیر کی حالت دراصل ایسے مظاہر ہیں جو فطرۃً ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اشیاء کا تغیر ان کے وظائف ہی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اعضاء کی حرکات ہی ان کے نشوونما اور ان کے انحطاط کی ضامن ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں چاہیے کہ معلول کو علت میں ضم نہ کر دیں۔ آگسٹ کونت اس غلط فہمی میں اس لئے مبتلا ہو گیا کہ اس کے زمانے تک دنیا ارتقائے نامی کے اصول سے مطلق نا آشنا تھی۔ ہم اس باب میں اس کے زمانے سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ آگسٹ کونت لمارک سے واقف تھا۔ وہ اس کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا بڑے احترام سے ذکر کرتا ہے۔ مگر باایں ہمہ کونت نے لمارک کے نظریہ کو قبول نہیں کیا اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ سارے حکمائے عہد اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ کونت ڈارون کے نظریہ سے بے خبر رہا اس لئے کہ ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" کے طبع ہونے سے دو سال قبل اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہرحال ہمیں یہ معلوم ہے کہ آگسٹ کونت نظریۂ ارتقاء کے

---

[1] ہم نے اس مسئلہ کی مزید توضیح اپنی کتاب "علوم اجتماعی کا نصب العین" میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو دسواں باب۔

باب ۱

ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مظاہر تغیر کے باب میں اس کی نظر چوک گئی اور وہ ان کی حقیقی ماہیت سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ جس مظہر کو وہ حرکت نامی کی اصطلاح سے واضح کرنے کی کوشش کرتا رہا اس کو بعد ارتقاء کہا گیا۔

بہرحال اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ آگست کونٹ ارتقاء نوعی کے نظریہ سے بے خبر تھا تب بھی بظاہر یہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ اس نے ارتقائے انفرادی کی طرف سے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی ہونگی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی یقیناً اس حقیقت سے آگاہ ہوگا کہ ہر جسم نامی کو مختلف حالتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جنھیں پیدائش، شباب، ادھیڑ عمر، بڑھاپے اور پھر فنا کی منزلوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض جگہ اس کے انداز تحریر سے اس کا ترشح ہوتا ہے کہ اس کو اس امر کا احساس تھا کہ اعمال تغیر اعضاء کے معمولی وظائف سے علیحدہ جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی خیال کو واضح کرنے کے واسطے اس نے بعد میں ہستی و حیات کے دو الگ الگ تصورات پیش کئے۔[1] اس کے بعد اس کے شاگرد لیترے نے عضویات کے ان دو حصوں میں امتیاز قایم کیا جن میں سے ایک کا مقصد جسم کی پرورش ہے اور دوسرے کا مقصد اس کا نشو ونما ہے مگر آپ دیکھینگے کہ اس بحث کی تائید میں جتنے دلائل پیش کئے گئے وہ سب ناکافی ثابت ہوئے۔

ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوگا اگر ہم میکانک کی سہ گونہ تقسیم کو عمرانیات اور حیاتیات جیسے پیچیدہ علوم میں رائج

---

[1] وہ اپنی کتاب "نظام سیاست ایجابی" جلد ۲، باب ۶ میں کہتا ہے "ہر وجود کی زندگی عبارت ہے ان تغیرات سے جو اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔"

کریں ۔ چنانچہ حیاتیات میں تشریح کو سکون اور عضویات کو حرکت سے متصف کر سکتے ہیں اور اسی طرح عمل ارتقاء Kinematics کے مترادف ٹھہرے گا ۔ یہ اصطلاحی مناسبت ہمارے خیال میں مطلق حیثیت نہیں رکھتی لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں اس مطابقت سے زیادہ صنعت ہے جو کونت نے قایم کرنے کی کوشش کی تھی ۔ چنانچہ ہم عمرانیات میں بلا کسی زحمت کے حیاتیات کا طریقۂ تحقیق اختیار کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اجسام نامی اور معاشروں کی ظاہری مشابہت سے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے ۔ ان دونوں کی مندرجۂ ذیل خصوصیات کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیئے :-

(۱) ان کے عناصر مشتملہ اور ان کی تنظیم یعنی اجتماعی ڈھانچے اور ان کے اعضاء ۔

(۲) ان عناصر و اعضاء کے وظایف ۔

(۳) ان عناصر و اعضاء کا ارتقاء یعنی ان کی ساخت اور ان کے وظائف کی پیہم تبدیلیاں ۔

چنانچہ اس مذکورۂ بالا تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم عمرانیات کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ اور ان تینوں حصوں کے لئے ہم حیاتیات ہی کی اصطلاحیں استعمال کر سکتے ہیں ۔ تشریح عمرانی، عضویات عمرانی اور ارتقائے عمرانی ۔ اور اگر کسی کو میکانک ہی کی اصطلاحات برقرار رکھنے پر اصرار ہو تو ہم یوں کہیں گے سکونی عمرانیات، حرکتی عمرانیات اور کنائی عمرانیات ۔

ان سب اصطلاحوں میں بڑا نقص یہ ہے کہ ان کی وجہ سے عمرانیات کے ڈانڈے ایک ایسے علم سے جا ملتے ہیں جو بجائے خود بہت سادہ ہے ۔ ان سے آدمی اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ گویا عمرانیات نے اپنے تئیں

باب ا

کلیۃً حیاتیات کے تابع کرلیا۔ ہمارا اپنا خیال ہے، عکن ہے اس خیال میں بعض معترضین کو علمی شان نہ نظر آئے، کہ عمرانیات کے پیش نظر تین چیزوں کی تحقیق ہونی چاہئے:-

(۱) اجتماعی ڈھانچے

(۲) اجتماعی اعمال و وظائف

(۳) اجتماعی ارتقاء

ہمیں یقین ہے کہ اس بارے میں کسی کو کوئی اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔

گیارھواں باب

عناصر اجتماعی

کسی خاص انسانی جماعت کے متعلق عالم عمرانیات اس وقت تک کوئی تحقیق نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ جماعت کن کن عناصر پر مشتمل ہے اور ان عناصر کی ترکیب کس نہج پر ہوئی ہے۔

خود ان عناصر کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول انسان، جن پر ہماری نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جن کے مجموعے سے بداہتہً جماعت عبارت ہے۔ دوسرے وہ اشیاء جو ہمیں انسان کے دوش بدوش نظر آتی ہیں اور جن کا انسانی اعمال سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ دراصل ان اشیاء کو بھی انسانوں کی طرح معاشرہ کے عناصر میں شمار کرنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ اشیاء کی حیثیت وہ نہیں ہوتی جو انسانوں کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ معمولاً مجہول ہوتی ہیں لیکن ہمیں یہ نہ فراموش کرنا چاہیئے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کا وجود حیات اجتماعی کیلئے

باب۔

ناگزیر ہوتا ہے۔ ان کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے چنانچہ عالم عمرانیات کی نظر میں ان کی اہمیت بے جا نہیں۔ اس واسطے پہلے ہم ان اشیار کے متعلق اظہار خیال کر دیں اور یہ بتا دیں کہ اجتماعی زندگی کس حد تک ان کی رہین منت ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد حیات اجتماعی کے سب سے زیادہ اہم عنصر یعنی انسان کی نسبت ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

معاشرہ کے غیر انسانی عناصر یعنی اشیا کو علمائے عمرانیات نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ جو براہ راست فطرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو انسانی صنعت کے توسط سے وجود میں آتی ہیں۔

جن اشیا کا تعلق بلا واسطہ فطرت سے ہے ان میں سے بعض کے متعلق ہم یہاں ذکر کریں گے۔ سب سے پہلے زمین کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ سارے انسانی اعمال زمین ہی پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ زمین کی ظاہری شکل وصورت کا انسانی اعمال پر خاص اثر پڑتا ہے، خاصکر اگر اس خطۂ زمین کو پہاڑ یا سمندر سے قرب حاصل ہے۔ پھر اس کے علاوہ زمین کے اندر جو دھاتیں ہوتی ہیں، یا درختوں کو اس سے جو خوراک ملتی ہے اس کا اثر صنعت و حرفت اور کاشتکاری پر پڑنا لازمی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اسی مناسبت سے ہم زمین کی بالائی فضا کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس بالائی فضا میں اس خاص خطہ کی آب وہوا، رعد و برق اور دوسرے مظاہر فضائی، اور وہ ساری طبیعیاتی قوتیں شامل ہیں جو عالم عمرانیات کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اسی ضمن میں ہم اس خطہ کے نباتات وحیوانات کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ سب عناصر انسان پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں اور خود انسان

ان سب کو اپنے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ باب ۱ اس طرح یہ سب اس کے اعمال میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

انسان اور بیرونی فطرت کے اس تعلق سے وہ دوسری قسم کی اشیاء وجود میں آتی ہیں جنھیں ہم صنایع کہتے ہیں اور ۱۱ جو انسانی صنعت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہم نے اس جگہ لفظ "صنعت" اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس معنی میں اسے بیکن نے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "صنعت مجموعہ ہے انسان اور فطرت کا"۔ اس واسطے کہ فطرت محض انسان کی صنعت کے مادّہ کو فراہم کرتی ہے۔ انسانی عمل سے یہ مادہ تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ ان صنایع کی بدولت انسان کی خاص خاص احتیاجات پوری ہوتی ہیں۔ انھیں سے ہمارے خورونوش، ملبوسات، مکانات اور خانگی سازوسامان تیار ہوتے ہیں۔ انھیں کی بدولت ہماری تعیشات کی چیزیں جیسے زیورات وغیرہ بنتے ہیں۔ جو اگرچہ بظاہر بیکار سہی مگر انسانوں کی ایک بڑی تعداد انھیں ضروری سمجھتی ہے اور عزیز رکھتی ہے انھیں سے اسلحات بنائے جاتے ہیں اور انھیں سے وہ آلے بنتے ہیں جن کی وساطت سے مذکورۂ بالا مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔

فطرت اور صنعت کے نازک فرق کو بعض اوقات اچھی طرح تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی پھل جب تک کہ وہ درخت پر رہتا ہے اس کا شمار فطرت میں ہوگا لیکن جب انسان نے اسے توڑ لیا اور اس میں انسانی خوراک کا جز بننے کی صلاحیت موجود ہے تو ایسی حالت میں اس کا شمار آخر الذکر شق میں کیا جائے گا۔ اس موقع پر ہم یہ صراحت کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تقسیم کو بے جا اہمیت دینے

باب ۳

ضابطوں سے جکڑ بند کرنے اور غیر ضروری غلو برتنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ نفس انسانی اپنے افکار و تصورات میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کی خاطر اشیاء اور افکار کے درمیان ایسے ایسے نازک اور دقیق امتیازات گھڑ لیتا ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ معاشرہ کی ساخت میں غیر انسانی عناصر کا جو درجہ ہے اس کی اہمیت سے عمرانیات چشم پوشی نہیں کرسکتی۔ اور یہ بھی ٹھیک نہیں کہ انھیں غیر ضروری اہمیت دی جائے۔ بعض علمائے عمرانیات کے نظام افکار میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور ان عناصر کو انسان سے زاید اہم بتلایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ادمون دیمولان کا نام پیش کرسکتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان کی ساری خصوصیات کا دارومدار اس کی خوراک پر ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک ہر نسل انسانی کی خصوصیات ان جغرافی حالات سے پیدا ہوئیں جن سے اس خاص نسل کے بزرگوں کو اس وقت دوچار ہونا پڑا تھا جب کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاکر آباد ہورہے تھے[1]۔ اس کے برعکس کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق حیات اجتماعی کی ساخت میں معاشی پیداوار کے آلات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ انسان کی سیاسی، ذہنی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل میں مادی ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔ دراصل

---

[1] ملاحظہ ہوں ادمون دیمولان کی تصانیف "عہد موجودہ کے فرانسیسی" اور "انسانی نسلوں کی شاہراہیں"۔

باب ۱۱

زندگی میں یہ سب سے زیادہ موثر عنصر ہے[1]۔ ہمارے خیال میں ان نظریوں میں مبالغہ کو راہ دی گئی ہے۔ اور محقق کا یہ فرض ہے کہ وہ عدل و احتیاط کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے[2]۔ ساتھ ہی ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان نظریوں میں جو بات صحت کے معیار پر پوری اترتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ انسان فطرت اور اشیاء کا محتاج ہے۔

حیات اجتماعی کی ساخت میں غیر انسانی عناصر کو جاہے جتنی زیادہ اہمیت دی جائے مگر انسانی عناصر ان سے کہیں بڑھکر اہم ہیں۔ ان کی تحقیق میں ہمیں علوم فطری اور علوم عمرانی دونوں کی چھان بین کرنا پڑے گی۔ علوم فطری سے ہمیں صرف ان خصوصیات کا پتہ چلے گا جو ساری نوع انسانی میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ اور علوم اجتماعی سے ہم ان خصائص کا سراغ لگا سکتے ہیں جو انسانیت کے مختلف اجزا میں موجود ہیں۔ چنانچہ علم تشریح الانسانی جسم کی عام ساخت سے بحث کرتی ہے اور علم اعداد و شمار اور علم نسل انسانی کی بدولت ہم کسی خاص انسانی آبادی کے متفرق اجزا یا نسل کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔ انسانی آبادیوں اور نسلوں کو سمجھنے کے لئے اور یہ جاننے کے لئے کہ عمرانیات ان کے حقایق سے کیونکر استفادہ کر سکتی ہے۔ ہمیں اپنی تمامتر توجہ اس حقیقت کے انکشاف کی جانب منعطف کرنی چاہیئے کہ انسان کن محرکات سے اثر پذیر ہو کر اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لئے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو اس کی کتاب "سرمایہ"

[2] ملاحظہ ہو جون برن کی تصنیف "انسانی جغرافیہ"

باب ۱۱

حیات اجتماعی کے ڈھانچے معاشرہ کے انسانی عناصر کے باہمی نظم و ربط سے کیونکر تیار ہوتے ہیں۔

مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم پانچ طریقے ایسے ہیں جن کی بنا پر ان انسانی عناصر سے اجتماعی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی سب سے قدیم صورت رشتۂ نسب وقرابت سے پیدا ہوئی ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے خون کے تعلق کی بدولت ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی بھی مختلف نوعیتیں رہی ہونگی۔ بہت عرصہ تک بعض محققین کا یہ عقیدہ رہا کہ اجتماعی زندگی کی قدیم ترین صورت خاندان پدرسری یعنی وہ خاندان ہے جس میں نر (باپ) کو پورا اختیار و اقتدار حاصل ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی تائید میں روما، یونان، ہندوستان اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن نصف صدی سے اس مسئلہ کی نسبت برابر تحقیق جاری ہے اور نئی نئی باتیں پیش کی جارہی ہیں۔ باشوفن، میک لینان، لوئی مورگن اور ان کے دوسرے ہم چشموں کی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ "خاندان مادرسری" اجتماعی زندگی کی قدیم ترین تنظیم ہے۔ اس تنظیم میں ماں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کہ آج جو اصول ہمیں فطری معلوم ہوتے ہیں ان سے بالکل متضاد اصول اکثر قدیم معاشروں میں رائج تھے۔ مثلاً یہ کہ قبیلہ کے باہر شادی کی جائے یا یہ کہ لازمی طور پر کسی مخصوص طبقہ کے اندر شادی کرنا۔ اسی طرح کثرت ازدواج اور کثرت شو کی رسوم بھی عام طور پر قدیم زمانے میں پھیلی ہوئیں تھیں۔ بعض اوقات اولاد اپنے باپ سے لاعلم ہوا کرتی تھی اور ہر

باب ۱۱

فرد دوسروں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا اور وہ اپنا الگ گھر بار نہیں رکھ سکتا تھا، وغیرہ۔[1] غرضکہ مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں اس قسم کی رسوم کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے مختلف نظاموں پر بحث کرنے کے بجائے ہم یہاں صرف اتنا بتلانے پر اکتفا کریں گے کہ خاندان کی ابتدا کے متعلق جو نظریئے پیش کئے گئے ان میں موجودہ تحقیقات کی بدولت بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ مگر باوجود ان نئی تحقیقات کے ہم اپنے اس دعوے میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ خاندان ہی وہ ادارہ ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی کی قدیم ترین یادگار رہ چکا ہے اس کی تنظیم کا مرکز باپ رہا ہو یا ماں۔

خاندان کے بعد جو اجتماعی تشکیل عمل میں آئی اس کا محرک رشتۂ نسب کے بجائے پڑوس تھا۔ مختلف خاندان، جو قریب قریب آباد تھے ان میں باہمی ربط وضبط بڑھا یہاں تک کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد گھل مل کے ایک ہوگئے۔ اسیطرح بڑے بڑے انسانی گروہ وجود میں آئے جنھوں نے اپنے اتحاد کو قرب مکانی پر مبنی ٹھہرایا۔ چنانچہ خاندان بڑھتے بڑھتے قبیلہ بن گیا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے ان مختلف مراحل کے

---

[1] ملاحظہ ہو جیرو ٹولون کی کتاب "شادی اور خاندان کی ابتداء" اس کتاب کے طبع ہونیکے بعد اور دوسری کتابیں اس موضوع پر شایع ہوچکی ہیں نئی تحقیقات کے نتائج "سالنامہ عمرانیات" کی جلدوں میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔ اب تک کسی نے بھی ان جستہ جستہ نتائج کو ترتیب دے کر ایسی کتاب نہیں لکھی جو قابل ذکر کہی جاسکے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نتائج بجائے خود قطعی نہیں ہیں اور ان کی اہمیت بہت محدود ہے۔

باب۱۱

متعلق چونکہ اب تک بحث کا سلسلہ جاری ہے اس واسطے ہم مناسب یہی سمجھتے ہیں کہ ان "ناموں" کے جھگڑے میں نہ پڑیں جو ان مراحل کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں اس سے مطلق سروکار نہیں کہ آیا ابتدائی انسانی گروہ بندی کیلئے بقول لتورنون "قبیلہ" کا لفظ زیادہ موزوں ہے یا بقول درکیم "جھنڈ" کا۔ ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ جب انسان کسی مخصوص خطۂ زمین پر آباد ہو گیا اور اس نے اور دوسرے انسانی گروہوں کو چاہے صلح اور امن سے اور چاہے جنگ وجبر سے اپنے میں ضم کرنا شروع کر دیا اس وقت قبائل ہی کے بطن سے ایک دوسری اجتماعی زندگی پیدا ہوئی جو ان سے جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ قدیم یونانی شہر، ایشیائی مملکتیں، رومی شہنشاہی، اور ان سب کے بعد ہماری جدید یورپی اقوام وجود میں آئیں۔ ان موجودہ اقوام کی تنظیم میں انسان کی ابتدائی گروہ بندی کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو خاندان آج بھی بدستور باقی ہے اور دوسرے یہ کہ رشتۂ نسب کا اصول موجودہ نسلوں کے لئے سنگ بنیاد کا کام دے رہا ہے۔ نسل کیا ہے؟ یہ بھی درحقیقت ایک بڑے خاندان کے نسل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ نسل کے افراد میں ہمیشہ نسبی تعلق موجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حد تک یہ تعلق موجود ہو۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو اپنے کو ہم نسل بتاتے ہیں یہ دعوی کرتے ہیں کہ ایک زمانہ میں، جو تعین کی سرحد سے پرے ہے، ان کے بزرگ ایک تھے۔ اسی امکان کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ہماری نسل کی رگوں میں ایک ہی خون موجزن ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی نسل مختلف اقوام کے علاوہ

باب ۱۱

میں پھیلی ہوئی ہو بالکل اسی طرح جیسے یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کی ملکی حدود میں مختلف نسلیں آباد ہوں۔ اس کے برخلاف افراد قوم کے تعلقات کو جو چیز متعین کرتی ہے وہ قربت مکانی ہے۔ مثلاً ہماری فرانسیسی قوم کی گروہ بندی کمیون کنٹن اروڈن دسمان اور ڈپارٹمنٹ کی صورت میں کی گئی ہے[1]۔ دوسرے ملکوں، اضلاع و صوبجات کی تقسیم کی گئی ہے۔ ماہرین اعداد و شمار اور وہ لوگ جنھوں نے انسانی آبادیوں کی گروہ بندی کے متعلق غور کیا ہے مختلف ممالک کی ملکی تقسیموں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ ان ماہرین کی تحقیق یہ بتلاتی ہے کہ کسی ریاست کی انسانی آبادی کی نسبت معلومات حاصل کرنے کے لئے صرف اعداد و شمار ہی جاننا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ رسل و رسائل کی آسانی کے متعلق کھوج لگائیں اور یہ دیکھیں کہ آبادی کہاں زیادہ گنجان ہے اور شہروں اور دیہاتوں میں یہ آبادی کیونکر بٹ گئی ہے۔ چنانچہ اس ساری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ باوجود ہزارہا سال گزر جانے کے انسانی گروہ بندی کے قدیم محرک یعنی نسب اور پڑوس آج بھی ہماری اجتماعی زندگی میں کارفرما ہیں۔

ان محرکات کے علاوہ اور بھی ہیں جو ہماری زندگی میں موثر ہیں۔ مثلاً ہم پیشہ ہونے کا محرک۔ ہر بڑے معاشرے

[1] فرانس میں ملکی نظم و نسق کی سب سے چھوٹی تقسیم کو کمیون کہتے ہیں۔ کئی کمیون سے ملکر کنٹن بنتا ہے۔ اور کئی کنٹن کے مجموعے کو اروڈن دسمان کہتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹ کی وہی حیثیت سمجھنی چاہیے جو ہندوستان میں صوبوں کی ہے۔ ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ ملکی عہدہ دار کو ریفے کہتے ہیں۔ مترجم

باب ۱۱

میں تقسیم کار کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنے تئیں ایک مخصوص کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں ان لوگوں میں آپس میں ہم مشربی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پھر ہوتے ہوتے یہی احساس برادری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اغراض و مفاد کے اشتراک کی بدولت ان میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ کے شخصیے (کارپوریشن) اور ہمارے زمانے کی سنڈیکیٹ اسی اصول پر وجود میں آئی ہیں۔ ہم نے ان دونوں کا ذکر اس غرض سے یہاں کیا تاکہ اس خاص نوعیت کی گروہ بندی کی اہمیت واضح ہو جائے۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ کہنا درست ہوگا کہ موجودہ زمانے میں اجتماعی زندگی کی تشکیل اسی اصول پر ہو رہی ہے۔
ہمیں چاہیے کہ پیشوں اور طبقوں کے تصورات کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ نہ کر دیں۔ وہ سب لوگ ہم پیشہ کہلائیں گے جو اپنی ذاتی محنت اور سعی سے ایک خاص قسم کا نتیجہ برآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ حیات عمرانی میں انھیں کونسا مرتبہ حاصل ہے۔ چنانچہ فرانس میں پیشۂ تعلیم میں ان سب لوگوں کا شمار کیا جائے گا جو تعلیم و تدریس کا کام کرتے ہیں یا کسی اور حیثیت سے ان کا سررشتۂ تعلیمات سے تعلق ہے۔ اس میں ریکٹر (Rector) سے لیکر گاؤں کا ادنٰی سا مدرس سب ہی شامل ہیں۔ اس کے برخلاف طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو معاشرے میں ہم رتبہ ہوتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے پیشہ اور کام کی نوعیت کیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ریکٹر کا شمار عمائدین سلطنت، قائدین ملت، اہل ثروت اور علمی دنیا کے چوٹی کے لوگوں کے ساتھ ایک طبقہ میں کیا جائے گا۔ اور گاؤں

کے غریب مدرس کو عملہ کے لوگوں اور صنعت و حرفت کے معمولی کارکنوں کی صف میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ جس دن سے ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے مزدوروں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے اتحاد کی قوت کو اپنے جائز مشترک مفاد کی نگہداشت کے لئے استعمال کریں۔ اُس دن سے طبقہ واری گروہ بندی کو دن بدن فروغ ہو رہا ہے۔ اس پر بڑی بڑی بحثیں ہو چکی ہیں کہ معاشرے میں یہ طبقے کیسے پیدا ہوئے؟ در اصل طبقوں کا احساس ان کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوا اور اب اس نے ایک متعین صورت اختیار کرلی ہے[1]

ان گروہ بندیوں کے علاوہ اور دوسری گروہ بندیاں ہیں جن کی نسبت یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔ شلاً بعض لوگ اپنے مشترک مقاصد کے اصول کے لئے باہم جمع ہوتے ہیں، ان مقاصد کی وہ خود اپنی پسند اور مرضی سے تعیین کرتے ہیں۔ چنانچہ کمپنیاں اور انجمنیں ہمارے زمانے کی حیات اجتماعی کی پیچیدہ اغراض اور متنوع دلچسپیوں کے باعث وجود میں آتی ہیں۔ معاشی دنیا میں تجارتی کمپنیاں اسی اصول پر وجود میں آتی ہیں۔ ذہنی دلچسپیوں کے اعتبار سے علمی، ادبی اور صناعانہ انجمنیں قایم کی جاتی ہیں۔ مذہبی خیال والے اپنے فرقے اور سیاست میں دخل رکھنے والے اپنی پارٹیاں بناتے ہیں۔ خوش وقتی کے لئے لوگ بزم، حلقے اور انجمنیں قایم کرتے ہیں جہاں ہم خیال دوست اپنا وقت گزار سکیں۔ وہ جن کے دل میں انسانیت کا درد ہے "خدمت خلق" کی انجمنیں قایم کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر گوشے

---

[1] ملاحظہ ہو Van Overbergh کی کتاب "عمرانی طبقہ" اور Arthur Bauer کی کتاب "عمرانی طبقے"۔

باب ۱۱

میں انسانوں کا باہمی اتحاد و تعاون بڑھ رہا ہے، ان کی تنظیم کو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ اسی تعاون عمل کے صدقے میں انسانی پیداوار کی بوقلمونی ہماری نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے دوسری طرف خود انسان ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اپنے سارے محبوب مقاصد حاصل کرتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ سچ ہے کہ اسی انسانی تعاون میں خود اس کی تباہی کا سامان بھی موجود ہے اور یہ خطرہ ہی اس تحریک کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس تعاون عمل کے فیضان کا اثر ہے کہ انسان اپنی سعی و جہد سے انتفاع کر رہا ہے۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ انسان کا مستقبل اس کے باہمی تعاون کی صلاحیت ہی میں مضمر ہے اور اسی میں اسے فلاح و سعادت کی راہ مل سکتی ہے۔

بارھواں باب

حیات اجتماعی

معاشرہ کے مختلف عناصر ترکیبی کو متعین کر چکنے کے بعد ہمیں چاہیئے کہ ان کی کارگزاری کا مطالعہ کریں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان عناصر کے وظایف اجتماعی زندگی میں کیا نوعیت رکھتے ہیں؟ چونکہ سارے مظاہر عمرانی ان عناصر کے تعامل سے وجود پذیر ہوتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں چاہیئے کہ ان مظاہر عمرانی کی چھان بین کریں اور انھیں مختلف مقدمات کے ماتحت ترتیب دیں۔ اس کے بعد ہم ان مختلف مقدمات کے باہمی ربط و تعلق پر بحث و فکر کریں گے۔

حقایق عمرانی شمار سے باہر ہیں۔ ان میں تنوع اور پیچیدگی پائی جاتی ہے، اسی بنا پر ان کی ٹھیک تقسیم نہایت دشوار اور نازک کام ہے۔ اس کے لئے متعدد بار کوششیں ہو چکی ہیں اور خود ان کوششوں کے طریقے شروع شروع میں متضاد ہوتے تھے۔ لیکن اب ادھر چند سالوں سے ان طریقوں ایک گونہ ہم آہنگی پیدا ہو چلی ہے۔ غالباً تھوڑے دن یہ سارے طریقے ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں گے۔

کے اختلافات دور ہو جائیں گے۔ جب ایسا ہو گیا تو ہم کہہ سکیں گے کہ مظاہر عمرانی کے مقدمات ترتیب پا چکے۔ اب ہم یہاں ان مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کرتے ہیں جن سے ان مقدمات کے فرق کو واضح کیا جا سکتا ہے۔

بلجیم کے ایک مشہور عالم عمرانیات موسیو گیوم دے گریف نے جو بروسلز کی نئی یونیورسٹی کے ریکٹر رہ چکے ہیں۔ آگست کونت کے اصول سے ان مظاہر عمرانی کی تقسیم اخذ کی ہے۔[لہ] ہم جانتے ہیں کہ آگست کونت نے علوم کی درجہ بدرجہ تقسیم میں اس امر کو مد نظر رکھا تھا کہ وہ علوم علیحدہ رکھے جائیں جن میں دن بدن پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے اور انھیں الگ رکھا جائے۔ جن کے موضوع کی تعمیم دن بدن کم ہو رہی ہے چنانچہ اس اصول کے موافق آگست کونت نے مظاہر فلکی، طبیعی، کیمیاوی، حیاتیاتی، اور عمرانی کے مابہ الامتیاز کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ گیوم دے گریف نے اسی اصول پر مظاہر عمرانی کو سات مقولات میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔ مظاہر معاشی، مظاہر خاندانی، مظاہر صناعی، مظاہر ذہنی (جس میں مذہب اور علم شامل ہیں) مظاہر اخلاقی، مظاہر قانونی، اور مظاہر سیاسی۔ اس تقسیم کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ موصوف نے اس تقسیم میں بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ اور جن حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے انھیں کوئی ابھی رد نہیں کر سکتا۔ یہ بات قابل افسوس ضرور ہے کہ آگست کونت کے تتبع میں اندھی

لہ ملاحظہ ہوں گیوم دے گریف کی مندرجۂ ذیل کتابیں:۔

(۱) مقدمۂ عمرانیات (۲) قوانین اجتماعی (۳) اجتماعی تبدیل حیثیت

تقلید سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ مذہب اور علم دونوں کو ایک ہی فصل کے تحت میں رکھا گیا ہے۔ دراصل آگسٹ کونت کا تو یہ عقیدہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد علم (سائنس) مذہب کی گدی پر براجے گا۔ لیکن مصنف موصوف کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ مذہب خالص علمی تحقیق سے ماسوا اپنا ایک مخصوص حلقۂ اثر رکھتا ہے۔ جس کا بالکل دوسری شکل اور نوعیت سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ گیوم دے گریف نے جو مقولات یا فصلیں قائم کی ہیں ان میں ہر کہیں یہ بات نمایاں ہے کہ بعض مظاہر کی تعمیم دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ یہ دعویٰ حق بجانب ہوگا کہ نظام سیاسی حیات عمرانی کے سب نظاموں سے زیادہ پیچیدہ ہے، اسواسطے کہ اس کی بناوٹ میں نظام معاشی، نظام ذہنی اور نظام اخلاقی سب کے اثر کی کارفرمائی موجود ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ نظام سیاسی میں مندرجۂ صدر نظاموں کے مقابلہ میں تعمیم کا عنصر کم پایا جاتا ہے؟ کیا ہم کسی ایسے معاشرہ کو اپنے تخیل میں لاسکتے ہیں جس میں نظام سیاسی موجود نہ ہو؟ جہاں کہیں نظام سیاسی موجود ہے وہاں اس کے دوش بدوش نظام خاندانی نظر آئے گا۔ اور اصل میں یہی نظام خاندانی بڑھتے بڑھتے آج نظام سیاسی کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہے۔ بعینہٖ اسی طرح یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مظاہر اخلاقی بہ مقابلہ مظاہر صناعی اجتماعی زندگی میں کم عام ہیں۔ ان چند سیدھے سادے اعتراضات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ پروفیسر موصوف کی دلچسپ کوشش میں کس قدر خیال آرائی کو راہ دی گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ موسیو گیوم دے گریف کے مندرجۂ صدر نظریہ میں آگسٹ کونت کی تعلیمات کی جھلک صاف نظر آتی ہے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑی حد تک انھوں نے ہربرٹ اسپنسر

باب ۱۲

کے خیالات کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ نظریۂ عضویاتی کے متبعین نے ہربرٹ اسپنسر کی اندھی تقلید میں یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ حیات اجتماعی میں بھی ان تین اہم وظائف کو مدنظر رکھنا چاہئیے جنھیں علم الحیات نے انفرادی زندگی میں تحقیق کیا ہے یعنی عمل تغذیہ، عمل تولید اور عمل اختلاط۔ اجتماعی زندگی میں مظاہر معاشی کی وہی حیثیت ہے جو انفرادی زندگی میں جسم کے عمل تغذیہ کی۔ مظاہر معاشی کے پیش نظر پیدایش دولت، تبادلہ، تقسیم و صرف دولت کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اجتماعی دولت وہی نوعیت رکھتی ہے جو نامی غذا۔ یہاں اس جگہ ہم نے اصطلاحی الفاظ استعمال کئے ہیں انھیں وہی مفہوم دینا چاہئے جو علمائے عمرانیات وحیاتیات نے قبول کیا ہے۔ اس سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ دولت سے مراد وہ سب کچھ ہے جس سے زندگی اپنا تغذیہ و پرورش کرسکے۔ پروفیسر موصوف نے مظاہر تولید کا ذکر کرتے وقت علم الحیات کی اصطلاح استعمال کی ہے حالانکہ اس کی بجائے حیات اجتماعی کی مخصوص اصطلاح "مظاہر خاندانی" استعمال کی جاسکتی تھی۔ علاوہ بریں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئیے کہ اجتماعی زندگی میں عمل اختلاط کی دو جداگانہ نوعیتیں ہیں۔ اس کے تحت جو اجتماعی اعمال آتے ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جن کا براہ راست ریاستی دخل اندازی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور بعض دوسرے ایسے ہیں جن میں ریاستی دخل اندازی موجود ہوتی ہے۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ ریاست مکمل معاشرہ سے عبارت نہیں ہوتی۔ ریاست دراصل معاشرہ کی وہ شکل ہے جس میں حکومت و قوانین کی بدولت اتحاد مقصد پیدا ہوگیا ہے۔ ریاستی حدود سے باہر سیکڑوں ایسے اجتماعی تعلقات ہیں جن میں ریاست کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مثال

کے طور پر ان تعلقات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو مذہب، اخلاق یا ذہنی اور صناعانہ اشتراک مذاق کی بدولت وجود میں آگئے ہیں۔ ان تعلقات کی نوعیت قانونی اور سیاسی تعلقات سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قانونی اور سیاسی تعلقات نہایت بچے تلے ہوتے ہیں اور ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں جبر کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ حیات اجتماعی کے عضویاتی نظریے کے متعین کہتے ہیں کہ موخر الذکر تعلقات سے ہستیٔ اجتماعی کی وحدت کا پتہ چلتا ہے۔

آئیے ان مذکورۂ بالا خیالات میں سے ہم ان عناصر کو الگ چھانٹ لیں جن میں جانبداری کی بو پائی جاتی ہے تاکہ ہمیں ایک ایسے تصور کے قائم کرنے میں آسانی ہو جس سے کسی کو اختلاف کی گنجایش نہ رہے۔ اس کے لئے ہمیں چاہیئے کہ اجتماعی زندگی کے مظاہر خاندانی کو ایک علیحدہ مقولہ تسلیم کرنے سے انکار کریں۔ اگر آپ خاندان کی ان ذی حیات بنیادوں کو نظر انداز کر دیں جن کا تعلق عضویات سے ہے تو اس کی حیثیت مظاہر اخلاقی کی ایک فصل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس دعوے کو بے چون وچرا مان لیں کہ مظاہر معاشی اجتماعی زندگی میں اعمال تغذیہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس دعوے سے دراصل مظاہر معاشی کی تعریف کرنے میں مطلق کسی قسم کی وضاحت کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ان کی حدود میں ایک طرح کی تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مظاہر معاشی اور دوسرے اعمال اجتماعی کی طرح عمل اختلاط سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تسلیم کر لینے سے مظاہر اجتماعی کی تقسیم میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف تو مادی زندگی کے حقائق سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں ہم مظاہر معاشی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسری طرف دماغی زندگی کے

حقائق ہیں جن میں بعض ایسے ہیں جو ریاستی دخل اندازی سے قطعاً مستغنی ہیں مثلاً اخلاقی، ذہنی، صناعانہ اور مذہبی مظاہر حیات۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ریاست کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مثلاً قانونی اور سیاسی مظاہر۔ اب اگر ہم اس تقسیم کو تسلیم کرلیں تو ہماری تحقیق کے سارے الجھاؤ سلجھ جائیں۔ یہ تقسیم نہایت سادہ ہے۔ اسے بیان کرنے میں جانے بوجھے اور عام فہم الفاظ کے استعمال کے علاوہ کوئی نئی اصطلاحیں نہیں گڑھنی پڑیں۔ اس تقسیم کے ذریعہ سے صرف ان مطالب کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جنھیں عقل سلیم مدتوں سے برابر تسلیم کرتی چلی آتی ہے اور دنیا کی سب زبانیں ان سے بخوبی آشنا ہیں۔ کیا اس کو صحیح سمجھنے کے واسطے یہ سب باتیں کافی ضمانت نہیں ہیں۔

ہم نے ابھی اوپر ان مقولات کا ذکر کیا تھا جن کے ماتحت مظاہر اجتماعی ترتیب پاتے ہیں۔ اب ہم اس مسئلہ کو چھیڑتے ہیں کہ ان مختلف مظاہر اجتماعی کے درمیان ان مقولات کی رو سے کس قسم کا ربط پایا جاتا ہے۔

بالعموم لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ان مقولات میں سب سے زیادہ حاوی اور جامع کونسا ہے۔ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔ عام طور پر ان جوابوں میں آپ کو دو متضاد رجحانوں کی جھلک نظر آئے گی۔ ان سے ہماری مراد مادی اور تصوری رجحانات ہیں۔ پہلے رجحان کے مطابق اجتماعی زندگی کی بنیادی حقیقت معاشی ہے اور دوسرے کے مطابق اس کی بنیادی حقیقت ذہنی ہے۔

کارل مارکس کا نظریہ پہلے رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نظریہ میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ فطرت انسانی کی قدیم ترین احتیاجات معاشی نوعیت رکھتی ہیں چنانچہ ان احتیاجات کو پورا کرنے کے ذرائع بہم پہنچانا اور پیدائش دولت کے آلات اختراع کرنا اجتماعی زندگی

کے دوسرے مظاہر کو بھی ترقی کی طرف مائل کرسکتا ہے۔ انسانی فطرت کی یہ احتیاجات گویا ہماری حیات اجتماعی کی بنیاد ہیں اور انھیں پورا کرنے کے جو وسائل تلاش کئے گئے ہیں انھیں اس عمارت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو ان بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔

دراصل مارکس کو یہ نظریہ اس زمانہ میں سوجھا تھا جب کہ خود اس نے اپنی آنکھوں سے وہ تماشا دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ کے قدیم طریقہ پیداوار کی جگہ مشین نے لے لی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جرمنی اور انگلستان میں گزارا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں خاصکر صنعتی انقلاب نے اجتماعی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ اس انقلاب سے جو اثرات مترتب ہوئے ان کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں غرضکہ انھیں تمام حالات کو دیکھکر مارکس نے اپنے نظریہ کے عام قوانین کی تدوین کی جسے تاریخی مادیّت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مارکس کے نظریہ کے لئے یہ اصطلاح اس لئے استعمال کی گئی کہ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسانی تاریخ کا ارتقا زندگی کے مادی محرکات پر مبنی ہے۔ باوجود مارکس کے مجتہدانہ زورِ خیال کے ہمیں غالباً یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اس نظریہ میں کسقدر انتہائی تنگ نظری اور جانبداری برتی گئی ہے۔ یہ نظریہ ہمارے خیال میں اجتماعی زندگی کی ایک نہایت غیر مکمل تاویل پیش کرتا ہے۔ اول تو یہ کہ آلات پیداوار اور طریقۂ پیدائش دولت کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہئے کہ وہ سارے مظاہر معاشی پر حاوی ہو جائیں۔ چونکہ گیوم دے گریف نے اپنے تصورات کی وسیع ترکیب میں کارل مارکس کے نظریہ کو اچھی خاصی اہم جگہ دی ہے اس لئے قدرتی طور پر وہ مظاہر معاشی میں تقسیم دولت کو اجتماعی زندگی کا قدیم ترین مظہر ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ دولت کو صرف اس وقت اجتماعی خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچتی ہے پھر بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ مظہر معاشی حیات اجتماعی کے

سب گوشوں پر حاوی نہیں ہے۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں کہ ادب، فنون لطیفہ اور علوم کی ترقی ایک حد تک معاشی ترقی پر منحصر ہوتی ہے لیکن اس کے اور دوسرے اسباب بھی ہیں جنھیں معاشی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم فلسفہ کے مختلف مسلکوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اپنے گرد و پیش کے اسقدر تابع نہیں ہوتے جتنے کہ اور دوسرے مسلکوں کے ساتھ ان کی وابستگی ہوتی ہے۔ غرضکہ اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مارکس کا نظریہ دراصل حقیقت اجتماعی کی ایک غیر تشفی بخش تاویل پیش کرتا ہے۔

آگسٹ کونت کا نظریہ مارکس کے نظریہ سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ ہم اس کو دوسری قسم کے تصور کی بہترین مثال قرار دے سکتے ہیں اس واسطے کہ وہ حقیقت ذہنی کو حیات اجتماعی کی اساس قرار دیتا ہے۔ کونت کھلم کھلا تصوریت کا حامی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری حیات اجتماعی کی بناوٹ خیال اور تجریدی علم کے تانے بانے سے ہوئی ہے۔ اجتماعی زندگی کی مختلف حالتوں کا تمامتر انحصار انسان کے کائناتی تصور پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ کونت نے انسانی تاریخ کو تین حالتوں میں تقسیم کیا ہے۔ دینیاتی حالت، مابعد الطبیعی حالت، اور ایجابی حالت۔ انسانی معیشت کی پہلی دونوں حالتوں میں توہم و بت پرستی اور توحید کا دور دورہ رہا، پھر تیسری حالت جو عہد حاضر کے بعد وجود میں آنے والی ہے اس میں علوم کی تخصیص و تجزیہ اور ان کی ترقی کا زمانہ ہوگا۔ چنانچہ بقول کونت ایک زمانہ آنے والا ہے جب کہ ایک ایسا فلسفہ رائج ہوگا جس میں انتزاج و ایجاب کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہونگی۔ اسے ہم عہد تعمیم سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عمران بشری کے ان مختلف دوروں میں آرٹ، سیاست اور فنون کی ترقی کا سارا دار و مدار علم و حکمت پر رہا ہے۔ ہم یہ اعتراف کرنے کو تیار ہیں کہ کونت کا نظریہ انسانی زندگی کے نہایت اعلیٰ تخیل پر مبنی ہے اور اس میں بعض ایسے

اجزا بھی ہیں جو صداقت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی وضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آگست کونت نے اپنے اس نظریہ سے جو بعیداز قیاس نتائج نکالنے چاہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ ابھی ہم نے یہ کہا تھا کہ فلسفہ کو اجتماعی زندگی کے مظہر معاشی سے قطعاً اور ہی تصور کرنا چاہیئے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ آرٹ، سیاست اور فنون کو علم وحکمت کے اثر سے آزاد تصور کرنا چاہئے۔ بھلا ماہر موسیقی کے اجتہاد، مدبر سیاسی کے داؤں گھات اور کاشتکاری یا صنعت و حرفت میں انہماک رکھنے والے کو طبیعی کے معمل یا مفکر کے حجرہ سے کیا واسطہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معاشرہ کی حیات اجتماعی میں ذہنی عنصر کی کارفرمائی بہت محدود ہے۔

اس بحث و نظر نے اب ہمیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مظاہر اجتماعی کے ایسے مقدمات نہیں ترتیب دئے جا سکتے جن کے تحت میں عمران بشری کے سارے مظاہر آجائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ نتیجہ نکالنا بھی صحت سے بعید ہوگا کہ حیات اجتماعی کے مختلف مظاہر میں باہم کوئی ربط و تعلق ہوتا ہی نہیں ہمارا تو خیال یہ ہے کہ یہ سب مظاہر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مثال کے طور پر اجتماعی زندگی کے ایک مظہر جنگ کو لیجئے۔ جنگ دراصل خالص سیاسی مظہر ہے۔ بالعموم یہ دو یا متعدد اقوام یا ان کی حکومتوں کی باہمی عداوت کے باعث وجود میں آتی ہے لیکن اس کے ساتھ جنگ کو معاشی اہمیت بھی حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ بین الاقوامی منڈیوں میں پیداوار کے مقابلہ کی وجہ سے وہ وجود میں آئے۔ پھر جنگ کی ذہنی نوعیت بھی ہے۔ دو تہذیبوں، دو مختلف ذہنیتوں یا دو زبانوں کے باہمی اختلاف سے بھی جنگ تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ آپ کو شاید دیکھکر تعجب ہو کہ بعض ایسی باتیں جن کا بظاہر جنگ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا محاربین میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا کام دیتی ہیں۔ جنگ کی حالت میں محاربین آرٹ، مذہب، اخلاق اور قانون سب

کو بطور حربوں کے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ جنگ جیسے المناک منظہر اجتماعی میں بھی ہر قسم کے دوسرے مظاہر اجتماعی موجود رہتے ہیں۔ جنگ کے علاوہ آپ کسی اور اجتماعی زندگی کے گوشہ کو لیجئے۔ مثال کے طور پر کسی ماتحت عدالت کے کسی ایک مقدمہ کا جائزہ لیجئے جہاں تک کہ طریقۂ کار کا تعلق ہے اس مقدمہ کا تعلق قانون سے ہوگا لیکن اگر آپ اس کے سب عناصر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ کی اصلی نوعیت اخلاقی ہے اکثر اوقات جانبین کے اعمال کا اصلی محرک منظہر معاشی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات سیاسی اثرات کا نفوذ پایا جائے۔ پھر ماہرین سائنس کو بھی کبھی کبھی اپنی رائے سے اس میں دخل دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ جیل خانہ کے پروہت کی صورت میں مذہب کو بھی بار مل سکتا ہے۔ اگر کوئی مصور اس مقدمہ کی کارروائی کی تصویر کھینچے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرٹ کو بھی اس کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہوگیا۔ غرضکہ ہمارے اس کہنے کا اصلی نشاء یہ ہے کہ حیات اجتماعی میں ہر لمحہ آپ مختلف نوعیت رکھنے والے عناصر کے اتحاد و تعامل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کبھی ایک عنصر غالب نظر آتا ہے اور کبھی دوسرا ان میں سے کسی سے چشم پوشی کرنا بڑی غلطی ہوگی عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر عنصر بجائے خود عمران بشری کی ناگزیر ضروریات کا ترجمان ہوتا ہے۔

اب ہمیں اس امر کا پتہ لگانا باقی ہے کہ آیا ہم نے جو مختلف عناصر کا تجزیہ پیش کیا اس کی کوئی معروضی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟ ہماری گفتگو سے یہ تو یقیناً مترشح ہوگیا ہوگا کہ یہ سب عناصر اپنا علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ابھی یہ کوشش کی کہ ان کے درمیان ایک قسم کا ربط و تعلق ثابت کریں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم کو اس کا حق حاصل بھی ہے یا نہیں؟ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ طریقۂ تحقیق درست نہیں ہے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم نے

باب ۱۲

جو **مقولات** (Categaries) قائم کئے ہیں ان کی کوئی معروضی اصلیت ہی سرے سے نہ ہو۔ بہر نوع اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی اجتماعی زندگی حرکت سے عبارت ہے اور اسکے اعمال اپنی ظاہری خصوصیت کے اعتبار سے معاشی یا اخلاقی یا سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ غرضکہ ہر حالت میں اس کے اعمال کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ دراصل ہم نے جو ان میں فرق و امتیاز قائم کیا ہے اس کی نوعیت موضوعی ہے کہ یہ امتیازات ہمارے عقل و تفکر کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ان میں ایک طرح کا تصنع پایا جاتا ہے۔ اسے دور کرنے کی بس ایک ہی صورت ہے کہ ان حقائق فکری کا ہماری جانی پہچانی اشیاء کے ساتھ ربط قائم کر دیا جائے۔ علم کی یہ خصوصیت ہے کہ جس چیز کی ماہیت وہ جاننا چاہتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ حیات اجتماعی کے تجزیہ کا مطلب یہی ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے اجزا میں تحلیل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ علم ایک حقیقت سے بہت سارے حقائق پیدا کر لیتا ہے لیکن اس سے اس کی غرض سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ بعد میں ایک ہمہ گیر وحدت کی تشکیل کرے۔[۱]

---

[۱] ہم نے یہاں مظاہر اجتماعی کی اس تقسیم کا ذکر نہیں کیا جو "سالنامۂ عمرانیات" نے قبول کی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:۔ عمرانیات مذہبی، عمرانیات اخلاقی و قانونی، عمرانیات تعزیری بشمول اعداد و شمار اخلاقی، عمرانیات معاشی، علم ترکیب عمرانی، متفرقات (زبان، آرٹ، فن)۔ ہمیں اس تقسیم پر اعتراض ہے۔ اول تو یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ اخلاق اور قانون کو ایک مد کے تحت میں رکھا جائے اور قانون میں سیاست کو ضم کر دیا جائے۔ پھر قانون تعزیری اور قانون سول کو جدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں "متفرقات" کی مد میں جو اس قدر بے جوڑ عناصر اکٹھا کر دیئے گئے ہیں انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس تقسیم میں جس ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی نرالی ترتیب ہے۔ عمرانیات مذہبی کو سب سے پہلے اسواسطے رکھا گیا ہے کہ مؤلفین رسالۂ ہذا کا خیال ہے کہ تہذیب انسانی کی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

تیرھواں باب

ارتقائے اجتماعی

معاشرہ کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ کبھی سکون کی حالت میں نہیں رہتا۔ اس کی ساخت میں خود اس کے وظائف کے اثر سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ انھیں تبدیلیوں اور ارتقائی کیفیت کی وجہ سے عمران بشری کے مسائل کی پیچیدگیاں اور الجھاؤ

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ:۔ ابتدائی صورت مذہبی رنگ میں ظاہر ہوئی۔ لیکن شاید انھوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی کرلی کہ مذہب اس پھول کے مانند ہے جو اخلاق اور قانون کی مضبوط ٹہنی پر کھلتا ہے اور جس کی آبیاری معاشیات کی جڑوں سے ہوتی ہے۔ علاوہ بریں وظایف اجتماعی کا ذکر اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ اس ڈھانچے کی شکل نہ پیش کی جائے جس سے یہ وظائف ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ "سالنامۂ عمرانیات" میں اس کے لئے "اجتماعی ساخت" کی اصطلاح کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس تقسیم کی مثال اس مخروطی شکل کی سی ہے جس کے اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہو گیا ہے۔ اب ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا بیکار سمجھتے ہیں اس لئے بس ان اشارات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ "سالنامۂ عمرانیات" کے مولفین کو خود اس امر کا اعتراف ہے کہ انھوں نے جو یہ تقسیم کی ہے اس کی غرض یہ ہے کہ عمرانیات پر جو کتابیں شایع ہو رہی ہیں انھیں ترتیب دینے میں سہولت ہو۔ چنانچہ اگر اس تقسیم کا منشاء صرف اتنا ہے تو (بقیۂ حاشیہ صفحۂ آیندہ)

پیدا ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں اس امر کی تحقیق کرنی چاہیئے کہ اس ارتقائی کیفیت کا اصلی سبب کیا ہے؟ صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ معاشرہ میں اعضائے عمرانی کے باہمی تعامل سے یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی مشین چلتی ہے تو وہ تھوڑی بہت گھستی ضرور ہے لیکن حیات اجتماعی کی مشین کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ باوجود شکست و ریخت وہ ویسی کی ویسی صحیح سالم رہتی ہے بلکہ آپ دیکھیں گے کہ بالعموم وہ جتنی زیادہ چلتی ہے اتنے ہی اس کے نقائص دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ معاشرہ میں یہ خصوصیت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں اگر ہم دو اسباب کی تہ تک پہنچ جائیں تو اس امر کی تصریح ہو سکے گی۔ اول تو ہمیں ارتقائی کیفیت کے اصلی محرک کی نسبت علم ہونا چاہیئے اور دوسرے اس مخصوص طریق کار کا کھوج لگانا ضروری ہے جس کے توسط سے ارتقا عمل میں آتا ہے۔

درحقیقت اجتماعی زندگی کی ارتقائی کیفیت کا حقیقی محرک انسان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنی حالت کو دن بدن سدھارے۔ انسان کی ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ وہ اپنی زندگی بہتر سے بہتر حالت میں بسر کرے۔ اور دوسرے جانداروں کی طرح، بقول اسپنوزا، انسان اپنی موجودہ حالت پر صبر و شکر نہیں کرتا بلکہ وہ نت نئے انداز سے اپنی زندگی کو وسیع تر اور بلند تر بنانے کا متمنی رہتا ہے۔ کائنات فطرت کی ساری

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ ہم اس رسالہ کے مؤلفین کو یقیناً قابل معافی سمجھتے ہیں اور انہیں اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ اپنی اس "زبردستی" کی تقسیم کو باقی رکھیں تاکہ علم عمرانیات کے مواد کو ترتیب دینے میں آسانی ہو۔ یہ تقسیم بس ایسی ہی سمجھئے جیسے کسی کتب خانہ میں کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کے لئے انہیں مختلف مضامین میں تقسیم کر دیا جائے۔

باب۱۳ ذی روح مخلوق میں صرف انسان ہی تنہا ہے جس میں آپ یہ صفت پائیں گے۔

ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے لئے انسان نے عقل کی ترقی کو اپنا رہبر بنایا ہے اور دوسرے جانداروں کے مثل انسان بھی یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے گردوپیش کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرے لیکن اس کی یہ جدوجہد اپنا ایک انوکھا انداز رکھتی ہے۔ بالعموم وہ یہ کام اپنے ذہن سے لیتا ہے۔ حیوانات جب اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کی یہ کوشش اضطراری اور وجدانی نوعیت رکھتی ہے برخلاف اس کے انسان قدم قدم پر عقل و تفکر کی روشنی ڈھونڈتا ہے اس کے ارادہ کی باگ دراصل اس کی قوت فکر و امتیاز کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی میں یہی ماحول سے مطابقت کی کوشش بلحاظ اپنے اثر کے بڑی وسعت اختیار کر لیتی ہے اور اسی کی بدولت انسان اپنے نفس پر اعتماد کرنا سیکھتا ہے۔ پھر اسے اس کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے نفس کے پھیلاؤ کی کوئی حد نہیں ہے۔ فرد بشر حیوانات کے مثل اپنے ماحول کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی جگہ اپنے عمل کی بے پناہ زد سے اسے ہر لمحہ مجروح کرتا رہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گردوپیش کا اثر اس کی فطرت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو سچ ہے کہ وہ بھی ماحول کی ہئیت کو بدلنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

عقل انسانی کی تخلیق کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صدہا سال سے ایجادوں کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ایک ایجاد سے دوسری ایجاد اس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے ایک دیے سے دوسرا دیا روشن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصورات کی تعداد جو عمران بشری کی ہدایت کرتے ہیں، وہ روایات جن کی انسان پیروی

کرتا ہے اور وہ اشیا جنہیں وہ برتتا ہے ان کی تعداد میں برابر روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ گبریل تارد نے سرمایہ کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ "وہ ہماری پے در پے ایجادوں کے مجموعے سے عبارت ہے" اس تعریف کی صحت میں مطلق کوئی کلام نہ رہے اگر ہم اس میں اتنا اور اضافہ کر دیں کہ یہاں ایجاد سے مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جن کی محسوس حیثیت ہے۔ پھر ہمیں اپنے ذہنی سرمائے اور مادی سرمائے میں فرق کرنا چاہئے۔ غرضکہ ہم نے دیکھا کہ اصولی طور پر یہ دعویٰ قابل تسلیم ہے کہ انسان نے اپنے علم نظری و عملی کے خزانے کو ہر زمانے میں بڑھایا ہے اور اس کے اعمال و وسائل معاش میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے۔

البتہ ہمیں اعتراف ہے کہ مذکورۂ بالا اصول کو مطلق نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے ابھی جس کلیہ کا ذکر کیا ہے اس میں بعض مستثنیات کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ من حیث المجموع تمدن انسانی کی رفتار ترقی کی جانب مائل ہے لیکن ہمیں یہ ماننے میں عذر نہ ہونا چاہئیے کہ اسے روکاوٹوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے اور کبھی کبھی الٹے پاؤں واپس ہونے تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اب اس پر غور کرنا چاہئیے کہ ایسا ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ بعض وقت آپ دیکھیںگے کہ انسان کے ذہنی قویٰ شل ہو جاتے ہیں اور اس کی عقل و فکر کی پرواز بلندیوں تک جانے سے گریز کرتی ہے۔ کبھی اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مہذب انسانی گروہ اپنے سے زیادہ متمدن معاشرہ کو اپنی چیرہ دستیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ چنانچہ چینی تمدن کی بے حرکتی پر پہلا سبب صادق آتا ہے اور پانچویں صدی عیسوی میں روستہ الکبریٰ کے تمدن کے تہ و بالا ہونے پر دوسرا سبب موثر نظر آتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسانی جماعتوں کا انحطاط کس قانون کے تابع ہے؟ اس قانون کے وضع کرنے کی متعدد بار کوشش ہو چکی ہے

باب ۴

مگر آج تک پورے طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ فرانسیسی مفکرین نے خاصکر اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ ہئیت اجتماعی مختلف قالب کیونکر اختیار کرتی ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ایک سیاسی نظام جو مخصوص حالات کے ماتحت وجود میں آتا ہے اگر وہ حالات بدل جائیں تو وہ نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نظام کی اوپری تہیں پہلے مٹینگی اور نیچے کی بنیادی تہیں کچھ دنوں تک مقابلہ کریں گی پھر وہ بھی ختم ہو جائینگی چنانچہ بالعموم یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انسانی تہذیب کی قدیم بنیادیں جو زندگی کی گہرائیوں تک پہنچی ہیں عمرانِ بشری کے واسطے انکا وجود زیادہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں ہٹائی جاسکتیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاشرہ کے مٹے ہوئے جماعتی اداروں کو رجعت پسندی سے ازسرنو زندہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ رومی شہنشاہی کے زوال پر دیسی چھوٹی خود مختار شہری ریاستیں نہیں وجود میں آئیں جس طرح یونان میں یا اٹلی میں ساتویں صدی عیسوی میں موجود تھیں برخلاف اس کے بڑے بڑے وسیع رقبوں والی مملکتیں تشکیل پذیر ہوئیں جن کے بطن سے ہمارے موجودہ یورپ نے جنم لیا ہے۔ دوسرے فرانسیسی حکیم تارد کا بھی یہ خیال ہے کہ ایک دفعہ جو نظامات قائم کئے جاتے ہیں وہ پھر سے ازسرنو کبھی نہیں قائم کئے جاسکتے۔ وہ اپنے اس نظریہ کو اصول لارجعتی کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی معاشرہ بھی یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنے ماضی کو دوبارہ وجود میں لاسکے۔ اگر بفرض محال یہ رجعت ممکن ہو تو بھی معاشرہ کی ارتقائی زندگی میں ایسے عناصر بدستور رہیں گے۔ جو اس کی موجودہ حالت کو ماضی سے مختلف رکھیں گے۔ ہمیں تارد کے اس اصول کو تسلیم کرنے میں مطلق پس وپیش نہ ہو اگر ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رہے کہ معاشرہ کی موجودہ حالت میں ایسے عناصر بھی بکثرت ہوتے ہیں جو اس کی قدیم حالت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ غرضکہ اس مسئلہ کو مختلف نوعیتوں سے جانچا جاسکتا ہے اور

ہماری رائے میں ایسا کلیہ وضع کرنا جو سب حالات پر حاوی ہو بڑی جرأت کا کام ہوگا۔ اس اصول رجعت کے سلسلہ میں اس کا بھی ذکر کردیں کہ بعض اہل فکر کا خیال ہے کہ معاشرہ اپنی قوت ارادی کے بل پر اپنے ماضی کو واپس لا سکتا ہے۔ ملک پولستان کے دو ماہرین عمرانیات پال وسینگلر وبن اور کاسیمیر دے کلسکو وزنے جن سے فرانس میں غالباً بہت کم لوگ واقف ہونگے۔ اجتماعی زندگی کی اس خاص حالت کے لئے "انقلابی ماضی پرستی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ انقلابی زمانوں میں بعض ملک قدیم اداروں کو از سرنو قایم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے موقع پر قدیم رومی عاملین کو پھر سے برقرار کیا گیا اور دستور اساسی میں کونسل ٹریبیون اور سینٹ کے الفاظ بھی جان بوجھکر اسی واسطے داخل کئے گئے۔ عود شاہی کے وقت انقلاب سے پہلے کے اداروں کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش ہوئی۔ جمہوریت ثانی نے جمہوریت اولی کے اداروں کی نقل کی اور اسی طرح شہنشاہیت ثانی نے شہنشاہیت اولی کے نظامات کا ہو بہو چربہ اُتارنا چاہا۔ مذکورۂ صدر مسائل کو اگر ہم اس مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان کی نوعیت بڑی حد تک محدود ہوجاتی ہے لیکن اگر ان سب کے واسطے ایک عام کلیہ وضع کیا جائے تو اس کی مدد سے مدارج ارتقاء کی مجموعی تصویر کے خدوخال بخوبی نظر آجائیں گے۔

ہم نے ابھی جس اجتماعی تصور کا ذکر کیا اس کے مطابق ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حیات اجتماعی کی قدیم مٹی ہوئی شکلیں کیونکر کبھی کبھی ہمیں اپنا جلوہ دکھا دیتی ہیں۔ علمائے عمرانیات نے اس تصور کے مختلف پہلوؤں پر بحث و نظر کی روشنی ڈالی ہے جس کا جائزہ لینا ہمارے لئے ازبس ضروری ہے۔ آگست کونت کا اس باب میں وہی خیال ہے جو اس کے استاد ہنری دے سینت سیمون کا تھا۔ یعنی یہ کہ تاریخ انسانی میں دو ایسے متضاد عہد پہلو بہ پہلو ایک دوسرے کے بعد آتے دکھائی

۱۳۱ب

دیتے ہیں جن میں ایک کو ہم تنظیمی اور دوسرے کو تنقیدی کہہ سکتے ہیں۔ اول الذکر میں حیات اجتماعی ایک خاص طرح کی شکل اختیار کرتی ہے اور دوسرے عہد میں وہ ہٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم ازمنۂ وسطیٰ کو عہد تنظیمی اور نشاۃ ثانیہ سے لیکر انقلاب فرانس کے زمانہ کو عہد تنقیدی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب ہمارے زمانہ میں ایک نئے عہد تنظیمی کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے۔ اسی قسم کا ایک قانون ہربرٹ اسپنسر نے بھی وضع کیا ہے جسے وہ قانون توازن کہتا ہے۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ یہ قانون محض عالم عمرانی ہی تک محدود نہیں بلکہ کائنات فطرت میں موثر ہے اس قانون کے مطابق عروج و زوال اور انضباط و انتشار باری باری سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دراصل یہ قانون نتیجہ ہوتا ہے ایک طرف مادے کے سمٹنے اور دوسری طرف حرکت کے پھیلنے کا اور پھر مادہ کے پھیلنے اور حرکت کے جذب ہونے کا۔ ان اصطلاحوں کی جگہ ہم اور دوسرے الفاظ ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں جن سے اجتماعی میکانیت اور طبیعی میکانیت میں ایک قسم کا ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے اسپنسر اور کونت کے نظریوں میں زیادہ فرق باقی نہیں رہے گا۔

دونوں نے انسانی تاریخ کو جوڑوں میں تقسیم کیا ہے ان دونوں کے علاوہ المانی حکیم ہیگل کا یہ کہنا ہے کہ انسانی تاریخ تین دوروں میں سے ہو کر گزرتی ہے جو ایک دوسرے کے بعد آیا کرتے ہیں۔ یعنی اثبات، نفی اور ترکیب۔ بقول ہیگل یہ قانون عمران بشری اور کائنات فطرت دونوں پر مساوی طور پر عاید ہوتا ہے اور ابدی منطق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس قانون کا عمل باری باری حسب ذیل طریقہ سے ہوتا ہے:۔

ایک تمدن قایم ہے یہ تو اثبات ہوا۔ اس تمدن کے وجود میں آتے ہی لوگوں میں بے چینی شروع ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ تمدن درہم برہم نہ ہو جائے مخالفین کو غلبہ

باب ۱۳

نصیب ہوتا ہے، یہ ضد نفی ہوئی۔ قدیم روایات کے پرستاروں میں پھر ازسرنو عمل کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی جدوجہد کی بدولت ان کی بعض خواہشیں تسلیم کرلی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک امتزاجی تمدن وجود میں آتا ہے۔ یہ تیسرا دور ہوتا ہے۔ اس امتزاجی تمدن کے قایم ہونے کے ساتھ پھر وہی تین دوروں والا ارتقائی چکر شروع ہوجاتا ہے۔ ہم ان تینوں دوروں کو عالم اجتماعی کی اصطلاح میں عمل ردعمل اور نتیجہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ان دوروں کی بہترین مثال ہمیں فرانسیسی قوم کی ایک صدی پہلے کی تاریخ میں ملتی ہے۔ پہلے قدیم حکومت تھی، پھر انقلاب ہوا، پھر شہنشاہیت اولی قایم ہوئی، پھر عود شاہی اور پھر جولائی والی بادشاہی۔

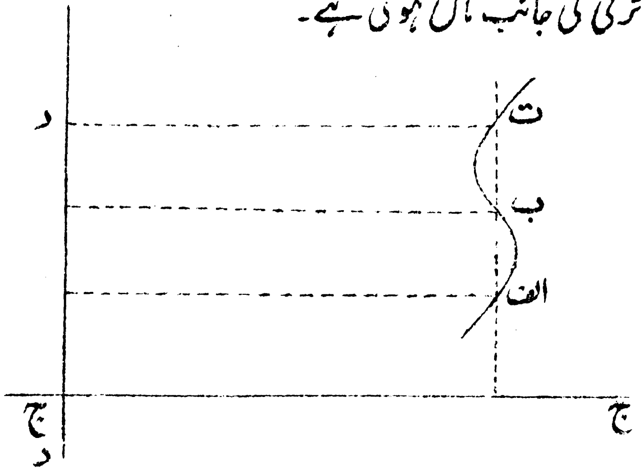
ہیگل کا خیال تھا کہ امتزاجی دور پہلے دونوں دوروں کے مقابلہ میں زیادہ مائل بہ ترقی ہوا کرتا ہے۔ آگسٹ کونت کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ عہد تنظیمی اپنے ماقبل عہد کے مقابلہ میں درمیانی تنقیدی عہد سے مستفید ہوتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ بھی اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ ایک فرانسیسی ماہر عمرانیات راول دے لاگراسری نے جن کا انتقال ہوگیا اپنی کتاب "ارتقائی ترسیمی شکل" میں مختلف اجتماعی نظاموں کی قدر مشترک کے متعلق نہایت دلچسپ خیالات کا اظہار کیا ہے[۱]۔ موصوف ویکو کے اس باب میں ہم خیال معلوم ہوتے ہیں کہ فطرت چکر کاٹ کر پھر وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں سے چلی تھی۔ فرانسیسی مفکر نے اس خیال پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ فطرت کا ہر چکر دراصل ترقی کی ایک منزل ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ دعوی غلط ہے کہ ارتقا کی رفتار ہمیشہ خط مستقیم کے مثل ہوتی ہے۔ اور وہ ویکو کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ ارتقا بالکل دائرہ کی پابندی کرتا ہے۔ ایسا کہنا بھولے پن پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا دعوی یہ ہے کہ ارتقا خط منحنی بناتا چلتا ہے (ملاحظہ ہو اگلے صفحہ کی ترسیمی شکل)

---

[۱] ملاحظہ ہو "عمرانیات کا بین الاقوامی رسالہ" ۱۸۹۵ء

باب ۱۳

ہر موڑ پر انسانیت اپنے ارتقاء کے ایک نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ اس ترسیمی شکل میں آپ دیکھیں گے کہ (ب) اور (ت) اسی خط عمودی پر واقع ہیں جس پر (الف) جو دراصل نقطۂ ابتدا ہے۔ مگر افقی طور پر آپ دیکھیں تو یہ دونوں نقطے (الف) سے زیادہ بلند ہیں۔ ان کے درمیانی فصل میں اثبات اور نفی، عہد تنظیم اور عہد تنقید، انضباط اور انتشار کی قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ بطور نتیجہ ترکیبی کیفیت پیدا ہوتی جو باوجود لغزش و رجعت مجموعی طور پر ترقی کی جانب مائل ہوتی ہے۔



ہم نے ابھی اوپر جن نظریوں کا ذکر کیا ہے انھیں عمرانیاتی تحقیق میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر نظریہ کی تائید میں تاریخ انسانی کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں تسلیم کرنے میں مطلق عذر نہیں ہے کہ ان سب نظریوں میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ ان نظریوں میں ایک بھی ایسا نہیں جسے صداقت کلی کے طور پر ہم مان لیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسانی ارتقا کی بوقلمونی اور پیچیدگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے ایک سادہ ضابطہ کے تحت میں لے آئیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ عمل ارتقا

ہر جگہ ایک اصول کے مطابق نہیں ہوا۔ اس کی ماہیت سمجھنے کیلئے ہمیں مختلف عہدوں، مختلف ملکوں اور مختلف نظاموں کی نوعیت کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ جس عہد، جس ملک اور جن واقعات کی تحقیق مطلوب ہے، ان کی مناسبت سے ہمارے سامنے تاریخ انسانی اپنے نئے نئے اور انوکھے رویوں کی نقاب کشائی کرے گی پھر آپ دیکھیں گے کہ ان سب رویوں کو متعارف اصول وضوابط کے تحت میں لانا ناممکن ہے۔ اس سے ہمارا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ عمرانیات کے جن اصولوں کی ہم نے تشریح کی وہ محض بے کار ہیں۔ بہ خلاف اس کے علوم عمرانی پر آپ کو جس قدر تبحر حاصل ہوتا جائے گا اسی قدر آپ کو اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ بعض اصول ان میں سے واقعات پر ایسے چسپاں ہوتے ہیں جیسے چسپاں ہونے کا حق ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کبھی ایک اصول عاید ہوتا ہے اور کبھی دوسرا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے جو اصول وضع کیئے ہیں وہ کماحقہ مکمل اور حاوی نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان بہت سارے واقعات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو ان اصول میں سے کسی کے تحت نہیں آتے محقق کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اجتماعی زندگی کے ان سب واقعات کے جملہ حقوق محفوظ رکھیں جو ہماری عقل اور ہمارے علم کے دائرے سے باہر ہیں۔

مذکورہ بالا بحث وتمحیص سے یہ بات تو یقینی طور پر صاف ہوگئی کہ ارتقا کے معنی ہمیشہ ترقی کے نہیں ہوتے۔ ارتقا ایک خالص علمی اور غیر جانبدار اصطلاح ہے اس کے مفہوم میں کسی عمل کی اچھائی یا برائی کی نسبت کوئی فیصلہ شامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس لفظ ترقی ہمیشہ اچھے معنوں میں آتا ہے۔ چنانچہ بہت سی ارتقائی حالتیں ایسی ہیں جن میں ترقی کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ پھر ترقی کے ساتھ رکاوٹوں کے وقفے اور رجعت لازم ہوتی ہے۔ ترقی کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ

باب ۱۲

مقامی اور غیر مکمل ہوتی ہے۔ ہم عرف عام میں جسے قومی ترقی کہتے ہیں، چاہے وہ حکمت عملی کے میدان میں ہو یا صنعت و حرفت میں، وہ دراصل دوسری قوم کے انحطاط سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کی زندگی کے ایک شعبہ میں ترقی ہو رہی ہو اور باقی دوسرے شعبے رو بہ انحطاط ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کسی قوم میں جنگجوئی اور بربریت کے وحشیانہ خصائل پیدا ہو جائیں۔ ترقی کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ ان میں باہم کوئی تعلق موجود ہو۔ ہم یہ بھی تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آیا اخلاقی ترقی کا جسے بلاشبہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، ذہنی اور مادی ترقی کے ساتھ کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی اخلاقی زندگی کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ تاریخ عالم میں بہت سارے ایسے مستثنیات موجود ہیں جو اس کلیہ کے تحت نہیں آتے۔

اب آخر میں اس کی توضیح کر دینی چاہیئے کہ لفظ "ترقی" سے کیا مراد ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ اقدار حیات کی بحث دراصل ایک موضوعی بحث ہے۔ چنانچہ لفظ "ترقی" کے معنی کی بھی موضوعی حیثیت ہے۔ دراصل ہم معاشرہ کی اس رفتار کو ترقی سے تعبیر کرتے ہیں جس کا رخ خود ہمارے ذاتی نصب العین کی طرف ہو۔ یہ نصب العین ہمیشہ شخصی ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی ضمانت نہیں کی جا سکتی کہ وہ حقائق پر مبنی ہو گا۔ چنانچہ اس نصب العین کے تعین میں جو اختلافات نظر آتے ہیں ان کی بنا پر بعض وقت خود ان کے وجود میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ ہر شخص ترقی کی ایک جداگانہ تاویل پیش کرتا ہے۔ اس بارے میں لوگوں کے اختلاف کی حالت یہ ہے کہ ایک کے نزدیک جو ترقی ہے وہی دوسرے کے نزدیک انحطاط ہے۔ سیاست

باب ۱۳

میں آپ آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ ایک سیاسی جماعت جن ذرائع کو مفید اور مائل بہ ترقی سمجھتی ہے دوسری سیاسی جماعت انھیں کو سخت مضر اور مائل بہ رجعت خیال کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ کس طرح حل کیا جائے؟ اس کے متعلق مفصل چھان بین کرنا ہماری اس کتاب کے حدود سے باہر ہے، یہاں ہم بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ معیشت انسانی کے مختلف شعبوں میں جو اقوام سب سے آگے آگئے ہیں اور انھوں نے عام طور پر ترقی کے جن معیاروں کو تسلیم کیا ہے، انھیں کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم ان ارتقائی حالتوں کو ترقی سے تعبیر کریں گے جن کا رجحان بنی نوع انسان کے بیشتر حصے کو مادی ذہنی اور اخلاقی آسودگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ سب ارتقائی حالتیں رجعتی ہیں۔ جو انسان کو ان نعمتوں سے محروم کرتی ہیں۔ عالم عمرانیات کو اگر ایسی صورت حالات سے سابقہ پڑ جائے جب کہ وہ خود مذکورۂ صدر معیاروں پر عقیدہ قائم نہ کر سکے یا ان کے نفس وجود پر اختلاف آرا رونما ہو تو ایسی صورت میں اس کے لئے بہترین طرز عمل یہ ہوگا کہ وہ ان واقعات کی اچھائی برائی کی نسبت کوئی فیصلہ نہ دے جو معرض بحث میں ہیں۔ اس کا فرض بس اتنا ہے کہ وہ واقعات کو ٹھیک ٹھیک پیش کر دے۔ اس کا منصب یہ نہیں کہ وہ ان کے خیر و شر کے متعلق اپنی رائے دے۔ ٹھیٹ علمی طرز عمل کی شان یہی ہونی چاہئے ہیں اس میں شبہ ضرور ہے کہ ایسا کرنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہم علمائے عمرانیات کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھولے سے بھی لفظ ترقی کو اپنی زبان پر نہ لائیں۔ وہ اپنا کام لفظ ارتقا سے بخوبی چلا سکتے ہیں۔

چودھواں باب

عمرانیات کا طریقہ تحقیق

ہم پچھلے ابواب میں ان مسائل کا ذکر کر چکے ہیں جو عمرانیات کا موضوع کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ ہماری بحث سے ظاہر ہو گیا ہو گا یہ واقعہ ہے کہ عمرانیات ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ ان سب مسائل کی نسبت خاطر خواہ حل پیش کر سکے۔ ابھی عمرانیات کو وجود میں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہم اس سے اس قسم کی توقع قائم کریں۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ عمرانیات نہایت سرگرمی سے اپنے منتہائے مقصد کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ اس باب میں ہم یہ بتلائیں گے کہ وہ یہ کام کس طرح پر کر رہی ہے۔ اور اس نے اس کے حصول کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب ہم عمرانیات کے طریقہ تحقیق کی نسبت چھان بین کریں گے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان علوم کو الگ الگ واضح کر کے بیان کریں جنھیں عام طور پر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الجھا دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں ان علوم کی امتیازی خصوصیات کیطرف اشارہ کر دیا ہے۔ ان علوم سے ہماری مراد ہے مخصوص

باب ۱ علوم عمرانی، عمرانیات اور عمرانی فنون۔ اول الذکر حقیقت عمرانی کے خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، عمرانیات حقایق عمرانی کے کلیات وضع کرتی ہے اور آخر الذکر کے پیش نظر یہ نصب العین رہتا ہے کہ موجودہ عمرانی حالت کو سدھارا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں علوم اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تحقیق کے جداگانہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔

پہلے ہم مخصوص علوم عمرانی کے موضوع کی تشریح کر دیں۔ اس جگہ ہم ان سب علوم کی مکمل فہرست نہیں درج کرنا چاہتے جو ان کے تحت میں آسکتے ہیں۔ آگے چلکر کسی جگہ ہم ان کا شمار کریں گے۔ اس وقت صرف مندرجہ ذیل پر اکتفا کیا جاتا ہے:

علم اعداد و شمار، علم النسل، معاشیات، تاریخ روایات (اسے علم روایات بھی کہہ سکتے ہیں) تاریخ مذاہب یا علم المذہب۔ ان سب علوم کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب استقرائی طریقہ تحقیق پر عمل کرتے ہیں۔ استقرائی طریقہ سے یہ مراد ہے کہ واقعات کی تصدیق سے کلیات قائم کئے جاتے ہیں۔ اس کی تصریح حسب ذیل ہے:-

اس طریقہ تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت مشاہدہ کو حاصل ہے۔ محقق کا فرض ہے کہ وہ ان سب واقعات کو پرکھے جو اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ معاشیات نے اپنی تحقیق میں مشاہدہ کے مختلف طریقوں سے نہایت مفید کام لیا ہے۔ اس کی ایک مثال ہمیں اعداد و شمار میں ملتی ہے جس کی بدولت ہمارے مشاہدات صحت سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ طریقۂ اختصاص ہے۔ اس طریقہ کے استعمال میں فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اس سے بالعموم یہ مراد ہے کہ کسی ایک مسئلہ کی نسبت سطحی معلومات حاصل کرنے کے بجائے اس کی خوب کھود کھود کر چھان بین کی جائے۔ حقیقت کا کھوج لگانے کے لئے یہ طریقہ بہت بہتر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن

باب ۱۴

اس طریقہ کی مدد سے کلیات قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس کی مدد سے ہم مواد بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے نتائج میں جان زیادہ ہوتی ہے۔ اور اہمیت کم۔ لیکن اگر ہم طریقۂ اعداد و شمار اور طریقۂ اختصاص دونوں کو ملا کر اپنی تحقیق کریں۔ تو دونوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اگر ہمیں ایسے واقعات کی نسبت تحقیق کرنی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرے تو ایسی صورت میں ہم ان دونوں مذکورۂ بالا طریقوں کے استفادہ سے محروم رہیں گے۔ ہم واقعات کی تصدیق خود اپنے تجربہ سے کر سکتے ہیں یا دوسروں کی تصدیق کو بطور شہادت پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمیں ایسے مظاہر اجتماعی کی تحقیق کرنی ہے جو مکان کے اعتبار سے ہمارے مشاہدے کی حدود سے پرے ہیں یا جو زمانہ کے اعتبار سے مختلف عہدوں میں وقوع پذیر ہوئے ہیں تو ایسی حالت میں ان کی جانچ پڑتال براہ راست ناممکن ہے۔ ان دونوں صورتوں میں حقیقت کا کھوج لگانے کا بس ایک طریقہ یہ ہے کہ جس قدر دستاویزیں اور شہادتیں ہمیں دستیاب ہو سکتی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اب ان دستاویزوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو انسانی شہادتیں ہیں جو ہمیں سیاحوں کے اقوال اور دیگر اشخاص کے بیانات کے ذریعہ سے ملتی ہیں اور دوسرے وہ غیر انسانی شہادتیں ہیں جن میں معاشرہ کے قدیم آثار کا شمار ہوتا ہے جو وہ مٹنے کے بعد صفحۂ عالم پر چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے عمارتیں، مکانات، لباس، آلات و اسلحہ اور زیورات وغیرہ، بعض اوقات یہ مادی شہادتیں اشخاص کے بیانات کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادی اشیاء غلط بیانی نہیں کر سکتیں۔ ان کا مقصد یہ کبھی بھی نہیں رہا ہوگا کہ وہ ہمارے نتائج کے واسطے کبھی شہادت کا کام دیں۔ غرضکہ ان دونوں اقسام کی

شہادتوں کو بڑی احتیاط سے قبول کرنا چاہئے اور نہایت سختی سے انھیں تنقید کی کسوٹی پر کسنا چاہیئے۔ محقق کی دشواریاں یہیں نہیں ختم ہو جاتیں۔ ان مختلف شہادتوں سے نتائج اخذ کرتے وقت اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان انسانی اور غیر انسانی شہادتوں سے نتائج مستنبط کرنے کو مجموعی طور پر ہم بالواسطہ مشاہدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

باب ۱۷

بالواسطہ اور بلا واسطہ مشاہدہ کے علاوہ تجربہ کے اصول کو بھی اس باب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ لفظ تجربہ کو یہاں استعمال کرتے ہوئے ہمیں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس سے خلط مبحث نہ پیدا ہو جائے۔ ہم آگے چلکر تفصیل سے بتلائیں گے کہ فنون عمرانی کا جہاں تک تعلق ہے تجربہ کا اصول نہایت کارآمد ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن علوم عمرانی میں اس اصول کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ تجربہ سے مراد یہ ہے کہ آپ بذات خود کسی خیال کو وجود میں لاتے ہیں اور بعد میں حقایق سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حیات اجتماعی میں اس طریقہ کا چلنا مشکل ہے نظم اجتماعی اس قدر اہم اور نازک چیز ہے کہ ہم صرف اس غرض سے اس پر کوئی تجربہ نہیں کر سکتے کہ بعد میں اس کے نتائج کا مشاہدہ کر سکیں۔ ایسا کرنا نری ناسمجھی کی بات ہوگی۔ اسمیں چنداں نقصان نہیں کہ آپ حیات اجتماعی کو سدھارنے اور بہتر بنانے کی نیت سے اس میں تبدیلی کریں لیکن محض اپنے ذوق تفتیش کی خاطر ایسا کرنا پرلے درجے کی ناعاقبت اندیشی ہوگی۔ چنانچہ ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کرنا چاہئے کہ تجربہ کا اصول عمرانی فنون کی حد تک نہایت کارآمد ہے مگر عمرانی علوم کی گتھی اس سے نہیں سلجھ سکتی۔[1]

---

[1] اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے تو وہ عبث ہوگا اسواسطے کہ ضروری نہیں کہ عالم عمرانیات کو رائے عامہ کی قوتوں پر تصرف حاصل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ رائے عامہ کے بغیر کسی قسم کا عمرانی تجربہ عمل میں آ ہی نہیں سکتا۔

اب جب کہ آپ نے اپنے مشاہدہ سے مختلف واقعات کو ایک جگہ جمع کر لیا تو دوسرا کام آپ کو یہ کرنا ہے کہ ان واقعات میں ترتیب پیدا کریں۔ اس کے لئے اور دوسرے طریقوں کی مدد درکار ہو گی یعنی اصول تقسیم، تحقیق علل، عمل استقرا یا وضع کلیات۔

اصول تقسیم کے متعلق ہم یہاں زیادہ تشریح نہیں کریں گے اس لئے کہ عمرانی معاملات میں ان کی نوعیت بعینہ وہی رہتی ہے جو اور دوسرے مسائل کی تحقیق میں۔ تقسیم کا کام یہ ہے کہ ان اشخاص یا واقعات کو مرتب کرنا جن میں بمقابلہ اختلاف ہم آہنگی کے عناصر زیادہ موجود ہوں یہ بھی ضروری ہے کہ ان اشخاص یا واقعات میں باہمی مشابہت مقابلۃً زیادہ پائی جاتی ہو۔ تقسیم کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ خصایص دریافت کریں۔ اشخاص یا واقعات کا شمار زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ خاص طور پر قدیم اساسی خصائص کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اس لئے کہ وہ دوسروں پر حاوی ہوتے ہیں اور ان کی علت ہوتے ہیں۔

اب ہماری بحث کا سلسلہ علت و معلول کے مسئلہ تک پہنچ گیا علوم عمرانی میں اس مسئلہ کی وہ حیثیت نہیں ہے جو علوم طبیعی میں ہے۔ علوم عمرانی میں اس کی نوعیت کم و بیش وہی ہے جو علوم اجسام نامیہ (Organic) میں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طبیعیات میں ایک منظہر دوسرے منظہر کی علت اس وقت قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ بالالتزام اس سے قبل نمودار ہوا ہو اور بعد میں دوسرے منظہر کو پیدا کرے۔ مثلاً پانی کے ابلنے کی علت وہ حرارت ہوتی ہے جو اسے پہنچائی جاتی ہے۔ مگر عالم ذی روح میں ایسا ہونا لازمی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ علت و معلول پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی منظہر سے کوئی دوسرا منظہر وجود میں آئے اور پھر بعد میں وہ دوسرا منظہر جو معلول کی حیثیت رکھتا تھا علت بن جائے۔ اس کی بہترین مثالیں ہمیں اعضا

باب ۱۴

اور ان کے وظایف کے باہمی تعلق سے ملیں گی جسم انسانی کے کسی پٹھے کو لیجیے۔ اس کی بناوٹ سے اس کے وظایف کی نوعیت معلوم ہوگی اور اس کے وظایف سے اس کی بناوٹ کے متعلق معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اگر اس پٹھے کی بناوٹ میں کوئی عیب ہے تو اس کا اثر اس کی کارگزاری پر پڑے گا اور اسی طرح اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے اس کی کارگزاری میں نقص پیدا ہوا ہے تو ضرور ہے کہ اس پٹھے کی بناوٹ میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں مختلف اعضا کے باہمی تعلق اور ان کے وظایف کے باہم دگر تعامل سے مل سکتی ہیں۔ دراصل عضو کی مثال ایک مرتب مشین کی سی ہے جس کا ہر جز دوسرے اجزا پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ نظام اعصابی اور قوائے ہاضمہ کے باہمی تعلق کا بھی یہی حال ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو چیز اعصاب کے واسطے مضر ہے لازم ہے کہ وہ ہاضمہ میں فتور پیدا کرے اور بالکل اسی طرح جو چیز ہاضمہ کے لئے نقصان رساں ہے وہ اعصاب کے لئے بھی مفید نہیں ہوگی۔ عالم عمرانی کا بھی بعینہ یہی حال ہے۔ بس اگر فرق ہے تو اتنا ہے کہ اس کی ساخت اور اس کے وظایف علم عضوی کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں، اور ان کا باہمی عمل و تعامل الجھاؤ سے خالی نہیں ہوتا۔ حیات اجتماعی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سیاسی، اخلاقی اور ذہنی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہتی ہیں اور اعضا جن کا زندگی کے مختلف رخوں سے تعلق ہوتا ہے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ ریل پہلے پہل معاشی اغراض پورا کرنے کی غرض سے بنائی گئی اور اس کے بعد میں ترقی ہوئی۔ لیکن اس غرض کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے اور بھی فائدے پہنچے۔ چنانچہ اس کی بدولت نئے خیالات کی نشر و اشاعت میں بڑی مدد ملی اور یورپ میں جمہوری طرز حکومت کا قیام ممکن ہوا۔ پھر ان مختلف مظاہر حیات کا اثر خود معاشی تنظیم کے

باب ۱۲

ازتقاء پر مترتب ہوا۔ عمرانی (علم الحرکت) کی یہ ایک مثال ہے۔ اس سے آپ کو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مختلف مظاہر کے علی التواتر وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے علت معلول ہیں اور معلول علت میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہمیں چاہیئے کہ عمرانی سکونیاتی نقطۂ نظر سے بھی غور کریں۔ مثال کے طور پر ہم ایک خاص زمانہ اور ایک خاص مقام یعنی فرانس کے عہد حاضر کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں ریلوں کا مکمل جال بچھا ہوا ہے، خیالات کی تحریک سرگرم کار ہے اور جمہوری حکومت کا دور دورہ ہے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حیات عمرانی کے مذکورۂ صدر تینوں مظاہر ایک دوسرے کو وجود میں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس مثال سے آپ خود یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں کر ایک ہی مقام اور ایک ہی زمانہ میں علت و معلول کے باہمی تاثرات وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اس مثال سے آپ پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ عالم عمرانی اور عالم نامی میں علت کا مفہوم اس سے مختلف ہے جو عالم طبیعی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین نے تو صاف صاف کہدیا ہے کہ ایک ہی اصطلاح کو اس قدر ایک دوسرے سے بعید مفہوموں کے لئے استعمال کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عمرانی تحقیق کے موقع پر لفظ علت کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی جگہ وظیفہ کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق جب کبھی دو مظاہر عمرانی کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنا ہو تو اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کے علتی تعلق کی تشریح کی جائے بلکہ صرف یہی کافی ہوگا کہ ان کے وظایف کے فرق کو واضح کر دیا جائے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ مروجہ اصطلاحات کو اس طریقہ سے درہم برہم کرنا ضروری نہیں، ہمارے نزدیک عالم عمرانی میں عالم نامی کی طرح باہمی تعلق کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں جن کی تہ میں علت و معلول کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے اول وہ تعلقات ہیں جو مختلف مظاہر عمرانی کے بیک وقت موجود ہونے سے

پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو مظاہر عمرانی کے یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہونے سے وجود میں آتے ہیں پہلی صورت میں ممکن ہے کہ ان تعلقات کی تہ میں آپ کو ایک خاص مظہر دوسرے پر غالب نظر آئے مگر بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ مظاہر جو ماتحت ہوتے ہیں اس مظہر پر اپنا اثر جما لیتے ہیں جو غالب ہوتا ہے، دوسری صورت میں اس مظہر کو جو پہلے ظہور پذیر ہوا بعد میں پیدا ہونے والے مظاہر کی علت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ موخر الذکر بھی اپنا انتقام لئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ اول الذکر پر اس قدر اثر ڈالتے ہیں کہ وہ خود اول الذکر کی علت بن جاتے ہیں۔ اس بحث سے آپ پر یہ بات روشن ہوگئی ہوگی کہ عالم عمرانی میں علت و معلول کی جستجو کس قدر دشوار اور نازک کام ہے۔ اس باب میں لازم ہے کہ ہم ان سب دعاوی سے اجتناب کریں جو تنگ نظری اور جانبداری پر مبنی ہوتے ہیں۔ سچا محقق وہ ہے جو کبھی اس امر پر فخر نہیں کرتا کہ اس نے فلاں مظہر کی علت دریافت کرلی۔ ہمیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ انسانی اعمال کے محرکات اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان کی نوعیتیں اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ کسی ایک اثر کو پیدا کرنے کے لئے متعدد اسباب کی کارفرمائیاں ضروری ہوتی ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئیے کہ علت و معلول کی خصوصیات بعض اوقات آپس میں الٹ پلٹ ہوجاتی ہیں۔ اس تمام بحث سے ہم ایک علمی ضابطہ اخذ کرسکتے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل نے اسباب و علل کی تحقیق کے سلسلہ میں چار اصول وضع کیے تھے جن سے سب لوگ واقف ہیں۔ وہ یہ ہیں:- اصول اشتراک، اصول اختلاف اصول تغییر متلازم اور اصول مابقی (Residue)۔ عمرانی مسائل کے حل میں شروع کے دونوں اور چوتھے اصول سے زیادہ مدد نہیں ملتی اس لئے کہ ان کی تحلیل کرکے انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اور بغیر اس کے اس کی کوئی صورت نظر

باب ۱۲

نہیں آتی کہ ان کی باہمی مطابقت یا اختلاف کو پورے طور پر واضح کیا جائے تیسرا اصول ہماری تحقیق کے لئے بہت کار آمد ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہم مختلف مظاہر عمرانی کے اختلاف وظائف کا پتہ لگا سکتے ہیں نیز اعداد و شمار میں استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آجکل فرانس میں دو ایسے عمرانی مظاہر موجود ہیں جو بہ اعتبار زمان و مکان متوازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری مراد ہے مظہر تخفیف آبادی اور مظہر اضافہ ٔ جس اندوختہ سے چنانچہ بعض علمائے عمرانیات کا خیال ہے کہ اول الذکر نے قطعی طور پر موخر الذکر پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ماہرین اعداد و شمار اجتماعی بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں سلے مِل نے اپنی کتاب "استقرائی و استخراجی منطق" میں ایک یہ اصول تو یقیناً ایسا پیش کیا ہے جو عمرانی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔

جب علت و معلول کا تعلق معلوم ہو جائے تو اس کی مدد سے کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل کو استقراء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر معاملہ میں اس طریقہ تحقیق کو استعمال کرتے وقت کمال احتیاط درکار ہے۔ اور خاصکر کے اجتماعی معاملات میں تو اور بھی زیادہ پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے اسباب کی تفصیل ہم ابھی بتلائیں گے منطقی طور پر اگر ایک مرتبہ علت و معلول کا تعلق پورے وثوق کے ساتھ قائم ہو جائے تو اس کی صداقت کلیہ کے طور پر مسلم ہو جانی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ ممکن ہے کسی معاملہ کی تحقیق کے وقت بعض اسباب ہمیں موثر نہ نظر آئیں اور کچھ عرصہ بعد کسی دوسرے مظہر کے پیدا کرنے میں

لہ ملاحظہ ہوں حسب ذیل کتب:۔ ارسین دومون کی کتاب "تخفیف آبادی اور تمدن"؛ جے دی نکوست کی کتاب "ازدواجی زندگی میں کم اولاد پیدا کرنے کا رجحان اور اس کے اعداد و شماری تحقیق"؛ ژاک برتیون کی کتاب "فرانس میں تخفیف آبادی"؛ پال لے روا بولیو کی کتاب "مسئلہ آبادی"؛ اور رینے ورم کی کتاب "توالد و توارث"۔

ان کا عمل دکھائی دے۔ چنانچہ پہلے معاملے کی تحقیق کے وقت ہیں جن مظاہر کے وجود کا گمان تک نہ تھا وہ ممکن ہے دوسرے مظہر میں نمودار ہوں۔ اس طرح آپ نے دیکھا ماہروں کی ساری دوربینی خاک میں مل گئی۔ اصل میں حقیقت یہ نہیں ہے کہ جس اثر کی توقع تھی وہ نہیں پیدا ہوا، وہ ظاہر تو ہوا مگر اس طرح کہ اس کی صورت بدل گئی اور اس پر دوسرے تاثرات کی تہیں جم گئیں۔ دراصل عالم عمرانی کی گوناگوں پیچیدگیوں اور تغیرات کے باعث ایسی صورت حالات وجود میں آتی ہے۔ اسی واسطے ہم نے ابھی کہا تھا کہ استقرائی کلیات عاید کرتے وقت انتہائی احتیاط درکار ہے۔ ان کلیات کو اگر وضع کیا جائے تو اس پر کبھی اصرار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ سارے عالم عمرانی پر حاوی رہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ عام طور پر اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان کلیات کو اس صورت میں پیش کریں تو ہمیں تجربے کی آئندہ تکذیب سے مطلق خطرہ نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسطرح ہم اپنے مستقبل کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

قوانین اجتماعی کی تقسیم دو مقولوں میں ہوسکتی ہے قوانین توارد اور قوانین تواتر۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ قانون، علت و معلول کے ان تعلقات سے عبارت ہوتے ہیں۔ جن میں تعمیم کی خصوصیت موجود ہو۔ انھیں تعلقات کے بطن سے ان کی تقسیمیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس جگہ ہم قوانین توارد کی نسبت کچھ کہیں گے۔ آج اس زمانہ میں تاریخ عالم کی جو خاص علمی تاویل کی گئی ہے اس کی رو سے نظام ہائے اجتماعی کو مجموعی طور پر ایسے حصوں میں تقسیم کیا ہے جو اپنی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں مثلاً یونان اور قدیم روما کے شہر، ازمنۂ وسطیٰ کے شہر، عہد جدید کی مغربی مملکت، عربی قبیلہ، یا قدیم امریکی قبیلہ وغیرہ: مندرجہ بالا تقسیم میں ہر مثال کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہے۔ جو اسے دوسروں سے ممیز کرتی ہے۔ ان مثالوں میں بعض مظاہر ایسے ہیں جو معاشی تنظیم کے باعث وجود پذیر ہوئے، بعض خاندانی نظام کے رہین منت ہیں

باب ۱۲ اور بعض دوسرے ایسے ہیں جو اخلاقی، مذہبی، ذہنی یا سیاسی محرکات کی بنا پر ظہور میں آئے۔ دراصل یہ سب خصوصیات آپس میں ایسی پیوست ہوتی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ اگر آپ کسی ایک خصوصیت کو دریافت کرلیں تو سمجھنا چاہئے کہ دوسری خصوصیات بھی موجود ہونگی۔ دراصل ان کی خصوصیت خود اسی پیوستگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قانون توارد سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خصوصیات ساتھ ساتھ ایک مظہر میں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ عمرانیات کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ ان سب مثالوں کی الگ الگ تحقیق کرے۔ یہ کام دراصل ان مخصوص علوم عمرانی کا ہے جن کے طریقۂ تحقیق کی نسبت ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ یہ طریقۂ تحقیق ایک قسم کا استقرائی عمل ہے۔

لیکن اصول استقرار کی تشریح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری یہ بحث ختم ہوگئی تحقیق کا ایک اور طریقہ ہے جسے طریقۂ استخراج سے تعبیر کرتے ہیں اس طریقہ کو بھی علوم اجتماعی میں بعض اوقات اچھی خاصی اہمیت حاصل ہوجاتی ہے اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ معاشیات نے جو علوم اجتماعی میں سب سے پہلے وجود میں آئی اور اس کی تکمیل ہوئی، اپنی تحقیق کی بنا تمامتر اسی استخراجی طریقہ کو ٹھہرایا۔ رکارڈو اور کارل مارکس کے ہاں اس طریقہ کے استعمال میں انتہائی غلو برتا گیا۔ اس کا ردعمل لازمی تھا اور اس کا اظہار اس صورت میں ہوا کہ کچھ دنوں بعد علمائے معاشیات نے طریقۂ استخراجی کے خلاف طریقۂ استقرائی کو ترجیح دینا شروع کردیا۔ ان علمائے معاشیات میں وہ لوگ شامل تھے جو تاریخی اصول کے حامی تھے۔ طریقۂ استخراجی کے خلاف انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طریقۂ استقرار نے اپنا حلقۂ عمل متعین کرلیا اور طریقۂ استخراج نے عمرانی فنون کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہم آگے چلکر بتلائینگے کہ یہ طریقۂ تحقیق اس مخصوص گوشہ میں کیونکر کامیاب رہا۔ عام طور پر یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ علمی تحقیق کے لئے استقرائی طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دعویٰ

ٹھیک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علوم اجتماعی کی تحقیق میں طریقہ استقراء کے ماتحت مشاہدہ، تقسیم، تلاش علت ومعلول سب ہی آجاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی چاہے تو طریقۂ استقراء کو استعمال کرچکنے کے بعد اسی کی بنیاد پر طریقۂ استخراج کی عمارت کھڑی کرسکتا ہے۔ جب ہم کسی عام اصول کو استقرائی تحقیق سے قائم کرلیں تو یقیناً ہمیں یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ استخراجی نتائج بھی اس سے اخذ کریں اور ان نتائج کو اپنی مزید تحقیق میں استعمال کریں۔ علاوہ بریں یہ عمل بھی قابل لحاظ ہے کہ خود استقرائی تحقیق میں بعض استخراجی عناصر نہاں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیاس دراصل استدلال کا بہت ہی عام طریقہ ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر مسلمہ اصول موضوعہ کے منطقی نتائج کو تسلیم کرنے میں پس وپیش نہیں ہوتا۔ ہم اس قسم کے استدلال رات دن استعمال کرتے ہیں اور غالباً شاید ہی کوئی ایسا فرد بشر ہوگا جو اس سے استفادہ نہ کرتا ہو۔ انسان کو قیاس سے محروم کرنے کے سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں ہوسکتے کہ آپ اس کی ذہنی قوت کو ضعیف ومجروح کررہے ہیں، ہاں ہمیں علوم سے یہ توقع رکھنا چاہیئے کہ وہ قیاس کو واقعات کی بلاواسطہ تصدیق کے بغیر نہ استعمال کریں۔ لیکن یہ کہنا کہ علوم کو کبھی قیاس کے پاس تک نہیں پھٹکنا چاہیئے۔ ایک بالکل لایعنی سی بات ہے۔

ہماری مندرجہ صدر تشریحات دراصل مخصوص علوم اجتماعی کے طریقہ تحقیق سے متعلق تھیں۔ ہم یہ پچھلے ابواب میں بتلاچکے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان مخصوص علوم کی جگہ عام عمرانیات سے علیحدہ تصور کرنی چاہئے عمرانیات ان تمام مخصوص علوم کی مجموعی صورت کا نام ہے۔ وہ ان سب کے امتزاج سے عبارت ہے۔ وہ ان علوم ہی سے اپنی ماخت کے عناصر جمع کرتی ہے اور پھر ان سے اپنی تشکیل کرتی ہے۔ چنانچہ ان وجوہ کی بنا پر ان علوم کے طریقہ ہائے تحقیق کی تشریح ضروری

تھی اس لئے کہ ہم ایسی صورت میں اس امر کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ عمرانیات اپنا مسالہ کیونکر فراہم کرتی ہے۔ ابھی ہمیں یہ بھی بتلانا باقی ہے کہ عمرانیات کس ڈھب سے اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے۔

عمرانیات کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف علوم اجتماعی کے عام نتائج کو ایک دوسرے سے قریب تر کردے۔ پھر ان نتائج کا باہمدگر تقابلہ کرے اور ایک کو دوسرے کی مدد سے مکمل کرے۔ اس کے بعد اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان سب نتائج میں امتزاج پیدا کیا جائے۔ عمرانیات کا کام یہ ہے کہ وہ حقیقت اجتماعی کے متضاد پہلوؤں میں ربط پیدا کرے۔ ان میں ہر پہلو ایک مخصوص علم عمرانی سے تعلق رکھتا ہے۔ عمرانیات اپنے نتائج قائم کرنے کے لئے علم النفس سے استفادہ کرتی ہے اور اس کے علاوہ ان دونوں علوم سے بھی وہ اپنا مواد بہم پہنچاتی ہے جو اس سے قبل وجود میں آچکے ہیں یعنی علم الحیات اور علم کائنات۔ عمرانیات عالم اجتماعی کے کلیات و قوانین وضع کرتی ہے اور جب کبھی ممکن ہو تو عالم ذی روح اور عالم طبیعی دونوں کے قوانین کے ساتھ اپنے کلیات کو مطابق بناتی ہے۔ ہم نے یہاں جن مسائل کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے وہ یقیناً مزید تفصیل کے محتاج ہیں۔ چنانچہ آیندہ باب میں ہم ان قوانین عمرانیات سے بحث کریں گے جو اس علم کے وجود میں آنے کے وقت سے آج تک وضع ہوتے رہے ہیں۔ اور جہاں تک ہمارے امکان میں ہے انہیں پوری صحت کے ساتھ بیان کریں گے۔ اس وقت صرف اتنا ذہن نشین کرلینا کافی ہے کہ عمرانیات کا اصلی طریقۂ تحقیق امتزاجی اصول پر مبنی ہے۔

اب ہم ذیل میں عمرانی فنون کے متعلق چند لفظوں میں اپنی رائے ظاہر کردیں۔ ہمارے خیال میں ان فنون کا اصلی منشاء یہ ہے کہ وہ اجتماعی عمل میں تنظیم پیدا کریں اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ ان فنون میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ یہ نصب العین اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ پورا انسانی چلن اس کے تحت میں آجاتا

باب ۱۲

ہے ۔ مثلاً معاشی فن کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آسودگی اور مرفہ الحالی کی زندگی بسر کریں ۔ اخلاقی فن خیر و فرض کے احساس کو عام کرنا چاہتا ہے ۔ پھر فن کا دستور ہے کہ اپنے نصب العین کو حقیقت سے دوچار کرتا ہے تاکہ اسکی روشنی میں اپنا اصول قایم کرے ۔ بعض مصنفین اسے "قیاس عملی"[1] سے تعبیر کرتے ہیں ۔ نصب العین کو کبریٰ سمجھئے اور حقیقت کی دشواریاں صغرا کا کام دیتی ہیں ۔ اب ان سے جو اصول اخذ کیا جائے گا اسے ہم نتیجہ کہہ سکتے ہیں ۔ فن کا یہ طریقہ در اصل اصول استخراج کے تابع ہے غرضکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم کا رجحان خاص سے عام کی طرف ہوتا ہے ۔ اور فن کا رجحان عام سے خاص کی طرف ۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ قیاس (Syllogism) اپنے نتائج کو حقائق کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا ۔ اگر عمل ان نتائج کو غلط ثابت کردے تو وہ بھی ان سے دستبردار ہوجائے گا یا پھر انہیں صحیح کرنے کی کوئی صورت نکالے گا ۔ اس کے طریقۂ عمل کی آخری منزل تجربہ ہے ۔ سیاسی فن کے لئے تجربہ کے بہت سے فضائل بیان کئے گئے ہیں نیز معاشی و اخلاقی فنون بھی تجربہ کے مفید ہونے کے قائل ہیں[2] ۔ اس اجمالی ذکر کے بعد ہم عمرانی فنون کے متعلق کچھ نہیں کہیں گے اس لئے کہ یہ موضوع ہماری کتاب کی حدود سے باہر ہے ۔ ہم نے یہاں اجمالی

---

[1] Syllogism of action

[2] ملاحظہ ہو لیون دوناکی کتاب "تجربی سیاست" ۔ اس کتاب میں مصنف نے یہ بتلایا ہے کہ قانون ساز اگر اپنے مجوزہ قوانین کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئیے کہ تھوڑے دنوں کے لئے کسی محدود خطّہ میں انھیں رائج کرے اور مقامی عہدہ داروں پر اس کی تعمیل چھوڑ دے ۔ کچھ عرصہ بعد اسے تجربہ سے ایسی بصیرت حاصل ہوجائے گی کہ حسب ضرورت ان میں تغیر و تبدل کرسکتا ہے ان کی تکمیل کرسکتا ہے یا انھیں منسوخ قرار دے سکتا ہے ۔

باب ۱۴ طور پر اشارہ اس واسطے کر دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ عمرانی فنون میں بمقابلہ علم، تجربہ و استخراج کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے[1]

---

[1] ہم نے اپنی کتاب "فلسفۂ علوم عمرانی" کی دوسری جلد جس کا نام "علوم عمرانی کے طریقہ ہائے تحقیق" ہے، ان تمام مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔

پندرھواں باب

عمرانیات کے قوانین

ہم نے پچھلے باب میں عمرانیات کی یہ تعریف کی تھی کہ وہ سارے علوم اجتماعی کے امتزاج کا نام ہے چنانچہ عمرانیات پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ علوم اجتماعی کے اعلیٰ ترین قوانین کا سراغ لگائے۔ عمرانیات کی نسبت یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا وہ اپنے اس فرض کے پورا کرنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟ لیکن ہماری رائے میں عمرانیات سے بہت زیادہ توقعات قائم کرنا بڑی غلطی ہے۔ ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس نے اپنی تحقیقات ابھی حال ہی میں شروع کی ہیں۔ دراصل اس قلیل عرصہ میں اس نے بہت کچھ امید سے زیادہ کام کر دکھایا ہے۔ آئیے ہم اس جگہ عمرانیات کی گزشتہ کارگزاری کا جائزہ لیں۔

اگر آپ ان بحثوں کو اپنے پیش نظر رکھیں جو پچھلے ابواب میں کی گئی ہیں تو ان کے مطابق آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی زندگی میں تین ایسے قوانین ہیں جو بین طور پر ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں۔ ہم ان تینوں قوانین کو تین خاص نقطۂ ہائے نظر سے پیش کریں تو ان کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:-

باب ۵

سکونیاتی، حرکیاتی، اور کیمیائی (Kinematic)

سکونیاتی نقطۂ نظر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانین توارد قائم کرتا ہے اس قانون کے توسط سے اجتماعی مثال (Type) کی خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں۔ ہم اس کے متعلق تشریح کر چکے ہیں[1] یہاں اس موقع پر ہم صرف ان اجتماعی مثالوں کا ذکر کریں گے۔ جو عام طور پر ہر جگہ مسلم سمجھی جاتی ہیں اور جنھیں تاریخ میں اہمیت رہی ہے۔ یورپ کی قدیم یونانی اور رومی تاریخ میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً (۱) خاندان (۲) شہر (۳) مملکت۔ پہلی اور دوسری مثال کے نمونے بکثرت ملتے ہیں مگر آخر الذکر کی مثال صرف ایک ملتی ہے۔ اس تاریخی دور کے بعد رومی مملکت میں شمالی وحشی قبائل کا دخل بڑھنا شروع ہوا۔ ان قبائل کی اجتماعی زندگی کے اصول کچھ اور ہی تھے۔ چنانچہ رومی مملکت کے تہ و بالا ہونے اور اس کی آبادی میں ان قبائل کے گھل مل جانے سے نئی نئی اجتماعی تشکیلیں وجود پذیر ہوئیں پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں گاؤں (Villa) اور جاگیرداروں کے زرعی علاقے وجود میں آئے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں کمیون (Commune) اور پندرھویں صدی میں ہمارے عہد حاضر کی مملکت کی بنا پڑی۔ اس باب میں مزید تحقیقات نے ہمارے خیالات میں بہت وسعت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ یورپ کی تاریخ کے علاوہ علم الاقوام[2] کی بصیرت افروز معلومات عمرانیات کے لئے بیحد مفید ثابت ہوئی ہیں۔ عربی اور بربری قبائل کے حالات کا خود ان میں رہکر مشاہدہ کیا گیا ہے، بنی اسرائیلی قبائل کے متعلق انجیل مقدس سے جو ہمیں جستہ جستہ حالات معلوم ہوئے تھے ان کی اب چشم دید واقعات سے جانچ پڑتال کر لی گئی۔ چینی شہر آنامی گاؤں، اور منگولیا کے

[1] چودھواں باب

[2] Ethnography

باب ۵

قبائل کی نسبت آج ہمارے پاس معلومات کا نیا ذخیرہ موجود ہے۔ ان مختلف تحقیقات کی بدولت ہم اپنے زمانہ کی زندگی کا ان مختلف عمرانی اداروں سے صحت کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان میں قدیم امریکی، آسٹریلوی، وسط افریقی، اور بالخصوص باہتو قبائل قابل ذکر ہیں۔ ان قبائل کی اجتماعی مثالیں ہمارے عہد حاضر کی مثالوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس ضمن میں دو مصنفین خاص طور پر قابل ستائش ہیں جن کی کوشش وسعی سے اس قسم کی تحقیق کے اصول مترتب ہوئے۔ ہماری مراد فسٹل دے کولانج اور لوئس ایچ مورگن سے ہے۔ اول الذکر نے یورپ کے ازمنۂ عتیق و وسطیٰ کی تحقیق کی ہے[۱] اور آخر الذکر نے غیر یورپی قبائل کی اجتماعی زندگی کی نقاب کشائی کی ہے[۲]۔ ان معلومات کے نئے ذخیروں کے علاوہ علم الآثار اور علم الحیوان کی روز افزوں ترقی کی بدولت محققوں کی ایک جماعت اس کوشش میں سرگرم کار ہے کہ انسان کے قدیم ترین امثال (Types) کا کھوج لگائے ہم اس کوشش کو قبل از وقت نہیں سمجھتے لیکن ہاں ہمارا خیال یہ ضرور ہے کہ اس کے نتائج برآمد ہونے کے لئے ابھی مدتیں چاہئیں۔

اب ہم حرکیاتی قوانین کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے وہ قوانین مراد ہیں جو حیات اجتماعی کی قوتوں کو کسی خاص نہج پر ڈالدیتے ہیں۔ آگسٹ کونٹ نے حرکیاتی قوانین کی دوسرے طور پر تاویل کی ہے۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان قوانین کو معاشروں کے قوانین اجسام نامیہ

---

[۱] ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب "قدیم فرانس کے سیاسی اداروں اور بلدۂ عتیق کی تاریخ"

[۲] موصوف کی تحقیق کا سلسلہ فریڈک انجلس نے جاری رکھا۔ ملاحظہ ہو انجلس کی کتاب "خاندان کی ابتدا اور ذاتی اور ریاستی ملک کا آغاز" ایچ راوے نے اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء۔

باب۵

سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ان قوانین میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم قانون یہ ہے کہ "انسان کم سے کم حرکت یا سعی کرنا چاہتا ہے" اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "انسانی گروہ کم سے کم کوشش یا کم سے کم صرف سے کسی خاص نتیجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے" یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "انسان اپنی سعی کے بدلے اعلیٰ ترین نتیجہ حاصل کرنا چاہتا ہے"۔ اس قانون میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ وہ محض عالم اجتماعی ہی پر عاید نہیں ہوتا بلکہ عالم نامی اور عالم طبیعی میں بھی اسیطرح موثر نظر آتا ہے۔ اگر آپ اس قانون کے متعلق غور و فکر کریں تو بآسانی آپ کو میکانیت کے اصول مدافعت اقل، کی اس میں جھلک دکھائی دیگی۔ عالم عمرانی میں اس قانون پر نفسیاتی عنصر غالب آجاتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کی تعمیل میں انسانی شعور و ارادہ کی کارفرمائی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ امریکی ماہر عمرانیات نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم اس قانون کو عمرانی زندگی میں "قانون کفایت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ قانون نہ صرف معیشت کے اعمال پر بلکہ اس کے عمل و احساس کی ساری قوتوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے بعد بے جا نہ ہوگا اگر ہم گبریل تارد کے "قانون نقل" پر بحث شروع کر دیں۔ ہم اس سے پیشتر اس قانون کی نسبت ذکر کر چکے ہیں کہ اس سے وہ انسانی عمل مراد ہے جس کے ذریعہ معاشرے میں اتحاد کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس اتحاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افراد آپس میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ اس قانون کی دو جداگانہ نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ابتداءً نقل یک طرفہ ہوتی ہے یعنی ادنیٰ اعلیٰ کی نقل کرتا ہے اور پھر بعد میں دونوں ایک دوسرے کی نقل شروع کر دیتے ہیں یعنی اعلیٰ بھی ادنیٰ کی نقل پر اتر آتا ہے۔ اس قانون کی دوسری نوعیت یہ ہے کہ شروع شروع میں یہ نقل باطنی حیثیت رکھتی ہے اور پھر ظاہری ہو جاتی ہے۔ یعنی پہلے پہل اپنے نمونے کی باطنی کیفیت کی نقل کی جاتی ہے اور پھر اس کی صورت کی بھی نقل شروع ہو جاتی ہے۔ ہم اس جگہ اس نظریہ پر زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کر سکتے۔ صرف اس قدر بتلانا ضروری ہے کہ تارد نے اپنے اس نظریہ سے بعض ایسے عمرانی حقایق کی طرف علمی دنیا

باب ۱۵

کی توجہ مبذول کرادی ہے جو اس سے قبل کسی اور مفکر کو نہیں سوجھے تھے۔ اس نے اپنی تحقیق میں بڑی صحت سے کام لیا ہے اور اس کے اجتہاد سے دوسرے محققین کی رہبری ہوئی۔

بلجیم کے عالم عمرانیات گیوم دے گریف نے، جن کی نسبت پہلے بھی ذکر آچکا ہے، تارد کے نظریہ کا خود اپنے نظریہ میں عجیب وغریب پیوند لگایا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ ہو بہو تارد کے خیالات کی تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ جھلک نظر آجاتی ہے۔ گیوم دے گریف کے نظام خیال کا سنگ بنیاد "قانون تحدید" ہے[1]۔ موصوف نے اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہر عمل کا حلقہ محدود ہوتا ہے چاہے اس عمل کا تعلق کائنات فطرت سے ہو، یا عالم نامی سے یا عالم عمرانی سے۔ ہم اس خیال کو واضح کرنے کے لئے عالم عمرانی کی ایک مثال اس جگہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلم امر ہے کہ کسی اصنعت کی پیداوار ہر جگہ نہیں پھیل سکتی، یا کسی ایک مذہب کے اصول وعقاید کی دنیا بھر میں اشاعت نہیں کی جاسکتی۔ قانون صرف ایک ملک کے لئے بنایا جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے چند ملکوں میں رائج کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا فاتح اور کشور کشا ساری دنیا کو اپنے زیر اقتدار نہیں لاسکتا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مثالوں سے قانون تحدید کی تشریح ہوگئی ہوگی۔ اس قانون کے عمل کی بدولت دنیا میں حریت اجتہاد اور تنوع کی رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہ قانون، قانون نقل کے ساتھ پاسنگ کا سا کام دیتا ہے۔ اس واسطے کہ آخر الذکر کے اثر کی ہمہ گیری اس کی وجہ سے محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں ان دونوں قوانین میں عمران بشری کے متعلق صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر ہم اپنی ایک رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں، وہ

---

[1] Law of Limitation

باب۱۵

یہ کہ ان مختلف قوانین کی وجہ سے حرکیاتی قوانین اور دوسرے عمرانی قوانین کا درمیانی فصل بڑی حد تک رہو جاتا ہے۔ قانون تحدید سے اجتماعی قوتوںکی روک تھام ہوتی ہے اور اسکا مقصد یہ ہے کہ ان قوتوں میں باہمی توازن قائم کرے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قانون میں سکونیاتی عنصر بھی موجود ہے۔ اس کے برعکس قوانین نقل کا تعلق حیات اجتماعی کی اس قوت سے ہے جو تغیر و تبدل پیدا کرتی ہے۔ ان قوانین کے مفہوم میں تواترد ارتقاء کا تصور پوشیدہ رہتا ہے۔ اور انہیں تغیر و حرکت کی خاصیت بدرجہ اتم موجود رہتی ہے۔

اب صرف کنائی قوانین کی تشریح باقی رہ گئی۔ دراصل ان میں اور قوانین ارتقاء میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی دو تقسیمیں خود بخود ہوگئی ہیں ایک کا تعلق ساخت کے ارتقاء سے ہے اور دوسری کا تعلق وظایف کے ارتقاء سے ہے۔

دراصل آگست کونت کا "تین ذہنیتوں" والا قانون اسی ارتقائے وظائف ہی کی دوسری شکل ہے۔ آگست کونت کا یہ قانون بہت مشہور ہے اور سچ یہ ہے کہ علم عمرانیات کی بنا اسی پر قائم ہوئی۔ اس قانون کی رو سے انسانیت کو تین ذہنی حالتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ اول دینیاتی ذہنیت کی حالت جس میں توہم پرستی، بت پرستی اور توحید کے دور شامل ہیں۔ دوسرے مابعد الطبیعی ذہنیت کی حالت جس میں انسان نے حقیقت کے متعلق تاویلیں پیش کیں اور تیسرے ثبوتی ذہنیت کی حالت جو تخصیص و تعمیم کے عہد سے عبارت ہے۔ ان ذہنیتوں کی مناسبت سے ان عہدوں کی حکومت کی خصوصیات تھیں۔ چنانچہ دینیاتی عہد میں جنگ آزما لوگ قوت و سطوت کے مالک ہوتے تھے۔ مابعد الطبیعی عہد میں یہ اقتدار فقہاء کے ہاتھ میں آگیا اور ثبوتی عہد میں محققین کی جماعت سب میں زیادہ باثر ہوگئی۔ ان عہدوں کی صنعتیں اور فنون بھی ان ذہنیتوں کا آئینہ ہوتے تھے۔ بلاشبہ اس نظریہ کی بلندی

اور وسعت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ دعویٰ بھی یقیناً ناقابل تردید ہے کہ انسانیت کی رفتار کا رُخ ثبوتی عہد کی جانب ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے ہمارا اعتراض وہی ہے جس کی نسبت ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم اجتماعی زندگی کے چلن میں ذہنی عنصر کے غلبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حیات اجتماعی میں ذہنی عنصر کا ارتقا اس طرح عمل میں نہیں آیا جس طرح کہ آگست کونت نے اسے پیش کیا ہے۔ آگست کونت کے زمانہ سے لیکر ہمارے زمانہ تک علم ترقی کے بہت سے مدارج طے کر چکا ہے۔ ہمیں اپنی تحقیق میں بعض ایسے عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جن سے کونت مطلق بے خبر تھا۔ زمانہ قبل از تاریخ اور تاریخ کے ابتدائی عہد کی نسبت اس کے زمانہ میں معلومات کا کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ دراصل یہ تحقیق اس کے بعد شروع ہوئی۔ کونت کا خیال تھا کہ دینیاتی عہد میں تخیل، مابعد الطبیعی عہد میں استدلال اور ثبوتی عہد میں تجربہ کے ہاتھ میں زندگی کی باگ رہی لیکن جدید تحقیقات سے جن کی نسبت ہم نے ابھی اشارہ کیا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں تخیل کو قدیم ترین موثر نہیں کہہ سکتے۔ تخیل کی ذہنی صلاحیت سے بہت قبل انسان پر ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے۔ جب کہ حیوانی ادراک کے ماسوا اس کا سارا ذہنی سرمایہ مضمحل حافظہ کے چند مرتب تصورات تھے۔ اس عہد میں انسان کی حالت، بقول ایس آر سٹینمٹنر پروفیسر علم الاقوام، جامعۂ امسٹرڈم "ان مادہ پرستوں کی سی تھی جن کی مثال اب کہیں نہیں مل سکتی"۔ انسانی ذہن کی ابتدائی حالت کے مقابلہ میں اس کے تخیل کی نشوونما دراصل اس کی ذہنی ترقی کی ایک بڑی منزل تھی۔ چنانچہ دینیات کا وجود اس حقیقت پر دال ہے کہ انسان کی عقل کا معیار اچھا خاصا بلند ہو چکا تھا۔ اب اگر ہم آگست کونت کے تین ذہنیتوں والے نظریہ کو قایم رکھنا چاہتے ہیں تو ضرور ہے کہ اس میں تھوڑی بہت اصلاح کیجائے۔ اس نے مابعد الطبیعی دور کو درمیانی

باب ۱۵

دور بتلایا ہے۔ ہم اسے دوسرے دونوں دوروں میں ضم کر سکتے ہیں اس طرح انسانیت کے ابتدائی دور کو جو دراصل اس کے اور سب دوروں سے زیادہ طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے، زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی تقسیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم انسان کی ارتقائی حالتوں کو اس طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ انسانیت کا ابتدائی دور وہ تھا جب کہ اس کے خیال کی بنیاد محسوسات پر تھی۔ اس کے بعد تجرید کا دور آیا۔ مدتوں وہ تجرید کی چار دیواری میں بند رہا۔ اب پھر ہمارے زمانے میں اس نے محسوسات کی طرف توجہ کی ہے لیکن وہ اب تک تجرید کی قدیم ذہنی عادتوں کو محو نہیں کر سکا ہے۔ وہ تجرید سے برابر استفادہ کرتا ہے۔ انسانی ذہنی ادراک سے تخیل تک پہنچا اور پھر تخیل سے استدلال تک۔ اب اس کا ذہنی رجحان یہ ہے کہ وہ ان سب مختلف طریقوں سے مستفید ہو کر حقیقت کا کھوج لگائے[1]۔

آگسٹ کونت کے بعد علمائے عمرانیات میں ہربرٹ اسپنسر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس انگریزی حکیم نے بھی اجتماعی وظائف کے متعلق ایک قانون وضع کیا ہے۔ اس قانون کی رو سے انسانیت کی ترقی کی رفتار عسکریت سے صنعت پرستی کی جانب مائل ہے، انسان کی ابتدائی تاریخ میں ہمیں بعض ایسے گروہوں کا پتہ چلتا ہے جو اپنی مشقت سے معاش پیدا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ایسے گروہوں کا بھی سراغ ملتا ہے جو اول الذکر کو لوٹ کھسوٹ کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

---

[1] یہ واضح ہے کہ آگسٹ کونت کی تقسیم کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ بعض اور مصنفوں نے دوسری تقسیمیں کی ہیں۔ لوئس ویبر نے اپنی کتاب "ترقی کی ہم آہنگی" میں بجائے تین عہدوں کے "دو ذہنیتوں کا قانون" پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں عہد باری باری سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ موصوف کا یہ نظریہ فکری اور مادی دونوں قسم کی ترقی پر یکساں حادی ہے۔

باب ۱

اس کے بعد ایسے زمانہ کا ہمیں علم ہے جب اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب پیدا ہوئی اور سب لوگ اپنی محنت سے گزر اوقات کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوٹ مار کی جگہ سب لوگ تخلیقی اعمال میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر کے اس قانون میں بہت سی ایسی باتیں نکلیں گی جو ہمارے کام کی ہیں اگرچہ بعض ایسے حالات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں جن سے ایک حد تک اس نظریہ کی تکذیب ہوتی ہے۔ اس سے ہم اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ عسکریت اور صنعت پرستی ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو نشو ونما پا سکتے ہیں۔ اس بنا پر شاید ان مظاہر کے متعلق کلیات قائم کرنا ذرا قبل از وقت ہوگا۔ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہئے کہ صرف ہربرٹ اسپنسر ہی نے اس قانون کی طرف توجہ نہیں دلائی ہے۔ اس سے پیشتر آگست کونت اس امر کی تصریح کر چکا ہے کہ اصولی حیثیت سے اجتماعی تفوق و اقتدار جنگ آزماؤں کے ہاتھ سے نکل کر مارکان صنعت کے ہاتھ میں جانا چاہئے۔ فی الحقیقت اس خیال کو سب سے پہلے پیش کرنے کا سہرا آنری دے سین سیمون کے سر پر ہونا چاہئے۔ وہ کونت سے بھی پہلے اس خیال کی طرف اشارہ کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ قانون سر ہنری مین نے اس سے بہت کچھ ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا تھا جن کا تعلق خاص کر قانونی تحقیق سے تھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسانیت کے ارتقاء کا میلان حیثیت (Status) سے معاہدہ (Contract) کی جانب معلوم ہوتا ہے جبکہ پہلی حالت میں حکومت کا قیام اپنے رعب و اقتدار پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری حالت میں حکومت تابع ہوتی ہے اپنے شہریوں کی بے روک ٹوک رضامندی کے۔ پہلی حالت میں فوجی قوت کا سطوت و اقتدار لازمی ہے اور دوسری حالت میں حکومت صنعت و حرفت کی پر امن تنظیم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ سر ہنری مین اور اس کے ہم وطن ہربرٹ اسپنسر کے خیالات میں توارد کا دھوکا ہوتا ہے۔ آخر میں ہم یہ بتلا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ دراصل ان دونوں

باب ۵

کے خیالات کا سرچشمہ مشہور فرانسیسی عالم معاشیات ای گو یو کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسانی تاریخ میں ایک ایسا زمانہ گزر چکا ہے جب کہ آدمی نے دوسرے آدمیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنی تمامتر توجہ کائناتِ فطرت کے پوشیدہ خزانوں کو دریافت کرنے کی طرف منعطف کر دی۔

ہربرٹ اسپنسر نے انسانی ارتقاء کے متعلق ایک اور دوسرا قانون پیش کیا ہے جسے وہ پہلے سے کسی طرح کم اہم نہیں سمجھتا۔ اس قانون کا تعلق وظائف کے ارتقاء سے نہیں ہے بلکہ ساخت کے ارتقاء سے ہے۔ اس قانون میں جماعتوں کی بناوٹ کے متعلق تشریح کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ قانون اجتماعی زندگی کے اسرار منکشف کرنے میں ہماری بہت مدد کرتا ہے۔ اس قانون کے مطابق ارتقاء کا میلان انتشار پذیر یک جنسیت سے مربوط غیر جنسیت کی جانب ہوتا ہے۔ یہ قانون تمام کائناتِ فطرت میں جاری و ساری ہے اس کی بدولت عالم طبیعی میں سحابیہ (Nebula) سیارہ کی شکل اختیار کرتا ہے، عالم حیات میں جنین خانہ کا ہیولی وظائف رکھنے والے اعضا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عالم عمرانی میں ابتدائی انسانوں کے غولوں سے، جن کی حیات اجتماعی کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا اور جس میں سب آدمی ایک دوسرے سے مشابہ ہوا کرتے تھے، ہماری موجودہ مملکتیں پیدا ہوئیں۔ ان مملکتوں میں جو افراد آباد ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی مخصوص صفات کا حامل ہے لیکن بایں ہمہ دوسروں کے ساتھ گوناگوں تعلقات کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارے علم میں اب تک عمرانیات کا کوئی ایسا قانون نہیں جو اس قانون سے بڑھکر حیات اجتماعی کی گہرائیوں تک پہنچتا ہو اور جس کی مدد سے عمرانی حقائق کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہو۔ میں ابھی ضمناً یہ بتلاؤنگا کہ اس قانون کی بدولت ہم نے فلسفہ کے ایک نہایت دقیق مسئلہ کا اچھوتا حل دریافت کر لیا جو سقراط اور افلاطون کے زمانہ سے لیکر آج تک عقل انسانی کو حیرت میں

ڈالے ہوئے تھا۔ اس مسئلہ سے ہماری مراد وحدت وکثرت کی ہم آہنگی ہے۔ اس قانون سے ہم یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ موجودات عالم میں وحدت وکثرت کا جلوہ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کا اختلاف محض ظاہری نوعیت رکھتا ہے۔ اس واسطے کہ فی الحقیقت وحدت اور کثرت دونوں دوش بدوش ارتقائی مدارج طے کرتے ہیں۔

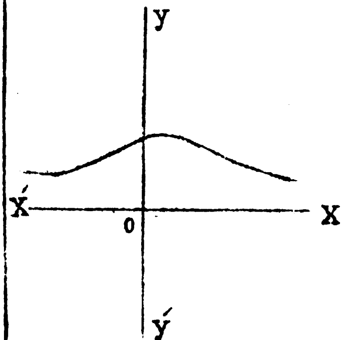
اسپنسر سے قبل ایک غیر معروف مگر نہایت قابل مصنف نے جماعتوں کی ساخت کے متعلق ایک اور نظریہ پیش کیا تھا۔ اس مصنف کا نام ادولف کیتلے ہے۔ وہ آگست کونت کا ہم عصر تھا۔ اور وہ علم اعداد و شمار کے بانیوں میں ہوا ہے۔ اس نے اپنے ایک نہایت پُر مغز مضمون میں جس کا عنوان "انسانی صلاحیتوں کی نشوونما" تھا[1] یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ارتقاء کی وجہ سے انسانی گروہوں میں متحد ہونے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ان گروہوں کے ارکان کے درمیان جو اختلافات ہوتے ہیں، چاہے وہ جسمانی ہوں اور چاہے ان کا تعلق دولت وثروت سے ہو، یا علم واقتدار سے، مگر وہ سب کے سب مٹ جاتے ہیں۔ منجملہ اور دوسری باتوں کے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ اجتماعی کا مرکز مستحکم ہو جاتا ہے اور خلاف معمول افراد کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ جو جماعت اس قانون کے زیر اثر ہوگی اس میں ایسے افراد کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا جو حسب معمول معیار کے مطابق ہوں گے۔ کیتلے نے ترسیم کے ذریعہ اپنے اس نظریہ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس ترسیمی شکل میں مختلف جماعتوں کو "گھنٹے کے خط منحنی" سے مشابہ ٹھہراتا ہے اور ان افراد کو جو معمولی معیار

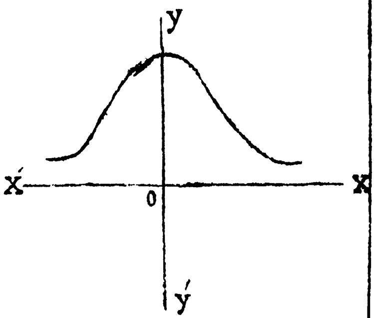
---

[1] یہ مضمون بروسلز میں "اجتماعی طبیعیات" کے نام سے کتابی شکل میں ۱۸۳۵ء میں اور پھر ۱۸۶۵ء میں طبع ہو چکا ہے۔

باب ۱۵

پر پورے اترتے ہیں بیچ میں جگہ دیتا ہے اور جو اس معیار پر پورے نہیں اترتے انھیں سروں پر رکھا جاتا ہے۔





امتداد زمانہ سے بیچ کا حصہ اٹھتا جاتا ہے اور سروں کے حصے ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور قریب ہوجاتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ کتلے کے اس نظریہ کا اثر ضرور ہے کہ کورنو اور تارد کے خیالات پر پڑا ہوگا۔

اب ہم اپنے ایک ہمعصر فرڈیننڈ تانیس کے نظریہ کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف جرمنی میں کیل یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور عمرانیات پر تبحر رکھتے ہیں۔ موصوف کے خیالات کو اپنے ہموطن محققین کے ہاں شرف قبولیت حاصل ہوچکا ہے[1]۔ اس نظریہ میں "جماعت"[2] اور معاشرہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور کیا گیا ہے۔ "جماعت" سے وہ انسانی گروہ مراد ہے جس کا حلقۂ اثر و عمل مقابلۃً محدود ہوتا ہے۔ مثلاً

---

[1] ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب "Gemeinschaft Gesellschaft" نیز ملاحظہ ہو گاستون رشتار کی تصنیف "علم عمرانیات"

[2] Community

باب ۱۵

خاندان، کلیسا اور ریاست برخلاف اس کے معاشرے سے وہ انسانی گروہ مراد ہے جس کا حلقہ بہت زیادہ وسیع ہو۔ اسے انسانوں کے خاندان عظیم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ ارتقار کا میلان "جماعت" سے معاشرہ کے جانب رہا ہے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں میں ضم ہو جاتی ہیں اور پھر بتدریج معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ہمارے مصنف کی وسیع مشربی کو یقیناً سخت ٹھیس لگی ہوگی جب انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہوگا کہ خاص ان کے وطن نے اس انسانی معاشرہ کا اس صدی میں ظہور پذیر ہونا ناممکن کر دیا جس کے متعلق اس نے اشارہ کیا ہے[1]۔

اب ہم ان نازک اور پیچیدہ مسائل کی نسبت خود اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حیات اجتماعی کی ساخت میں بیک وقت دو ایسی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں مگر درحقیقت ان میں باہم دگر ربط پنہانی موجود ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ ایک تحریک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی گروہ بندی زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور دوسری کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں وجود میں آتی ہیں۔ اگر آپ یورپ کی عہد جدید کی تاریخ پر، شمالی وحشی اقوام کے حملوں سے لیکر آج تک، نظر ڈالیں تو سب سے پہلے آپ کو چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں دکھائی دیں گی۔ ہر گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا جس کے حدود اقتدار مقرر ہوتے تھے۔ بتدریج یہ حدود بڑھنا شروع ہوئیں۔ اس کے اسباب کی مختلف نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی باہمی جنگ و جدال، کبھی شادی بیاہ اور کبھی وراثت کی بدولت ایک سردار مختلف جاگیروں کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ چنانچہ کاؤنٹی (County) اور ڈچی (Duchy) اسی طرح ابتداءً وجود میں آئیں۔ پھر آہستہ آہستہ

[1] جنگ عظیم کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم

باب ۵

بادشاہوں نے ان جاگیروں پر اپنا تسلط جمایا اور حقیقی مملکت کی بنا پڑی چنانچہ یورپ میں تقریباً ایک ہی زمانہ میں اس طرح سے کوئی ایک درجن ریاستیں وجود میں آئیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اجتماعی تحریک بس یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ سولھویں صدی عیسوی کے بعد سے تجارت نے ساری دنیا کی طنابیں کھینچ دیں ہیں جسکی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ علمی اور فلسفیانہ خیالات کی رَو مختلف ملکوں کی سرحدوں کو اسی طرح سے عبور کر رہی ہے جیسے کبھی پُرانے زمانہ میں مذہبی خیالات ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا کرتے تھے۔ مختلف ملکوں کے قوانین میں دن بدن مشابہت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قوموں کے رسوم میں یکسانیت آتی جاتی ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کی بدولت بقول ہوسیوگریار مختلف لوگوں میں ہم وطنی کے سے تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب رجحانات کو دیکھکر قیاس یہ کہتا ہے کہ اتحاد یورپ آہستہ آہستہ اپنا جنم لے رہا ہے۔ اسی کو آگست کونت نے مغربی جمہوریت سے تعبیر کیا تھا جس قدر جلد اس تحریک کے اثرات امریکہ اور دوسرے براعظموں میں سرایت کریں گے اسیقدر جلد یہ ممکن ہوگا کہ ساری انسانیت ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جائے۔ بلاشبہ انسانی ترقی کو رجعتوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت تو یہ رجعت ایک ایسی حقیقت معلوم ہوتی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا![1] ازمنۂ قدیم کی تاریخ بھی ان رجعتوں سے خالی نہیں ہے۔ روما جب اپنی حیات اجتماعی کی تمام ارتقائی منزلیں طے کر چکا تو وحشی حملہ آوروں کے ہاتھوں وہ تباہ و برباد ہوا۔ غرضکہ ارتقائی تحریک بدستور جاری ہے اور کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں آپڑینگی انہیں دور کیا جائے گا اور ایک نہ ایک دن یہ تحریک ضرور اپنے منتہائے مقصد تک پہنچ جائے گی لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس ارتقائی

---

[1] جنگ عظیم کی طرف اشارہ ہے (مترجم)۔

باب ۱۵

تحریک کے پہلو بہ پہلو اجتماعی زندگی میں ایک اور دوسری تحریک چپکے چپکے اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کا عمل واثر اول الذکر سے بالکل مختلف ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر بڑی قوم میں چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ گروہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں اور ان کے اصول عام طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔ پیشے، طبقے، اور خلقی رجحانات کی بنا پر ہزار ہا انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ جوں جوں معاشرہ کے حدود وسیع ہو رہے ہیں اسی قدر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ سیکڑوں نئے نئے گروہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں اس تخلیقی عمل کو ترتیبی شکل سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس شکل کو مختلف چھوٹی چھوٹی اشکال میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے دائرے ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوں گے اگرچہ ہوں گے سب ایک بڑے دائرے کے اندر۔ ایک دائرہ جاگیرداروں کے طبقے کی نمایندگی کریگا یہ ایک اور بڑے دائرے کے اندر ہوگا۔ اسے ہم کاونٹی (County) کہہ سکتے ہیں۔ تیسری قسم کے دائرے تعداد میں کم ہوں گے۔ ان کا رقبہ مقابلۃً زیادہ وسیع ہوگا۔ انھیں مملکتیں سمجھئے۔ جس طرح دوسرے دائرے میں آپ نے دیکھا تھا اسی طرح ہر دائرہ کے اندر بھی چھوٹے چھوٹے دائرے ہوں گے۔ اور تیسرے بڑے دائرے کے اندر ان کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ اجتماعی زندگی کی وہ تقسیمیں ہیں جن کی بابتہ ہم ذکر چکے ہیں۔ بہرحال حیات اجتماعی کی ساخت کے دو میلان ہیں۔ ایک تو وہ جو اتحاد و ائتلاف پیدا کرتا ہے اور گروہوں کی تعداد میں تخفیف کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اختلاف پیدا کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ دراصل اگر غور سے دیکھیے تو ان دونوں میلانوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ اس واسطے کہ موخر الذکر میلان کی بدولت جو نئی اکائیاں وجود پذیر ہوتی ہیں وہ ان سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں جنھیں اول الذکر میلان فنا کرتا ہے۔ چنانچہ دوسرے الفاظ میں ہم اس حقیقت کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ وحدت و کثرت ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

باب ۱۵

ہم نے مندرجۂ صدر اوراق میں ان قوانین کا ذکر مختصر طور پر کر دیا جنھیں عمرانیات پیش کرتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب قوانین مسلمہ طور پر صحیح اور مکمل ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ سب کسی نہ کسی عمرانی حقیقت پر مبنی ہیں اور حیات اجتماعی میں ان کی عام اہمیت قابل لحاظ ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ سب قوانین جیسا چاہیئے باہم گر مربوط نہیں ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ لازمی طور پر ایک دوسرے کی ضد بھی نہیں کہے جا سکتے۔ ان قوانین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ عمرانیات بہ حیثیت علم ابھی مکمل نہیں ہوا مگر آہستہ آہستہ مکمل ہو رہا ہے۔

حصہ سوم

سولھواں باب

عمرانیات کا تعلق علم کائنات اور علم الحیات کیساتھ

پچھلے ابواب کی بحثوں سے یہ بات پوری طور پر واضح ہوگئی ہوگی کہ عمرانیات کا موضوع کیا ہے؟ اس باب میں ہم ان تعلقات کی نوعیت بتلائیں گے جو عمرانیات اور اس سے قریب تر علوم کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ہماری اس تحقیق سے عمرانیات کی تحقیق کا راستہ ٹھیک ٹھیک متعین ہو جائے گا۔

سب سے پہلے ہمیں جاننا چاہیئے کہ عمرانیات اور ان علوم کے درمیان کیا رشتہ ہے جو اسکے وجود میں آنے سے قبل موجود تھے۔ ہمارا روئے سخن علم کائنات اور علم الحیات کی جانب ہے۔

علم کائنات کا تصور غیر متعین ہے۔ ہمارے خیال میں اس اصطلاح کے تحت وہ سب نظریئے آجاتے ہیں جو فطرت غیر نامی کے متعلق اب تک

پیش کئے گئے ہیں علم کائنات کی تحقیق کائنات فطرت کی ساخت اور اس کی حرکت کے متعلق اعلیٰ ترین خیالات سے بحث کرتی ہے ۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم میکانیت، فلکیات، طبیعیات اور کیمیا کے بنیادی اصول کی ترکیب سے بنا ہے ۔

علم کائنات کی اس تعریف سے آپ غالباً یہ نتیجہ نکالیں گے کہ عمرانیات کو اس علم سے زیادہ سروکار نہیں ہو سکتا ۔ اور یہ واقعہ ہے کہ معاشروں کی ساخت مادے کی بناوٹ سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ بادی النظر میں عمرانیات کو اس علم سے کوئی مدد نہیں مل سکتی ۔ آج ہمارے زمانے میں بھی بعض محقق اس کھلی ہوئی حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ عمرانیات کو اپنی تحقیق میں علم کائنات سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں ۔ چنانچہ بعض مصنفین نے یہ کوشش کی ہے کہ استخراجی اصول پر عمرانی میکانیت تیار کریں ۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو علم و دانش میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں جیسے لیون ونیارسکی سوئٹزرلینڈ میں، اسپریڈیون ہاریت رومانیہ میں اور اے پورتوندوای بارسیلیو اسپین میں[1] ۔ لیکن ان لوگوں کی کوششوں کو زیادہ کامیابی اب تک نصیب نہیں ہوئی ۔ ان لوگوں نے بس اتنا کیا ہے کہ ان مسائل کو جو عام زبان میں بیان کئے جاتے ہیں انوکھے اور مغلق الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے طریقۂ تحقیق سے ہمارے علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا ۔ ظاہر ہے کہ عمرانیات اہم مسائل مساوات (Equation) کے ذریعہ سے حل ہونے والے ہیں نہیں ۔ حیات اجتماعی کے پیچ در پیچ عناصر

---

[1] لیون ونیارسکی کی حسب ذیل کتب ملاحظہ ہوں :-

(۱) "معاشی توازن کے دو نظریئے" (۲) "عمرانیات کے بعض جدید نظریوں کی تصحیح" (۳) "تاریخی مادیت اور عمرانی میکانیت ۔" اسپریڈیون ہاریت کی مشہور تصنیف کا نام "عمرانی میکانیت" ہے ۔ بارسیلو کی کتاب کا ہسپانوی زبان سے فرانسیسی میں ترجمہ ہو گیا ہے اور اس کا نام "عمرانی میکانیت کی بیاض" ہے ۔

باب ۱۶

اور ان کے ہیم تغیر و تبدل کے باعث اس قسم کی کوشش ہی کرنا بے سود ہے[1]۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جانا چاہئے کہ میکانیت کی تحقیق عمرانیات کے واسطے بیکار ہے۔ ہم نے اس کتاب کے دسویں باب میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ آگست کونت کے نظریہ کو مکمل کیا جاسکتا ہے اور اس کی تصحیح کی جاسکتی ہے اور میکانیت کی تقسیم کو عمرانیات میں بھی رائج کیا جاسکتا ہے ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ عمرانیات فلکیات، طبیعیات اور کیمیا کے حقایق سے خوشہ چینی کرسکتی ہے۔ آگست کونت کا یہ کہنا بالکل سچ تھا کہ اگر سالوں اور دنوں کی طوالت میں کسی قسم کا فرق آجائے تو حیات اجتماعی میں عظیم الشان تغیرات پیدا ہوجائیں۔ اسی طرح عمرانیات کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کیمیا اور طبیعیات کے قوانین کی بدولت ہماری زندگی کے حدود متعین ہوتے ہیں اور ان سے زندگی میں مدد ملتی ہے لیکن بس اس سے زیادہ آگے بڑھنا زیادتی ہوگی۔ اگر کسی عمرانی فن کی مدد سے کائنات فطرت کی قوتوں کو کام میں لایا جائے جیسے مختلف دھاتوں اور پٹرولیم کو صنعت میں استعمال کرنا، تو ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مسائل کا تعلق خالص عمرانیات سے نہیں ہے۔

۳۔ علم الحیات کا تعلق عمرانیات کے ساتھ بہت قریبی ہے۔ مظاہر عمرانی دراصل افراد کی زندگی کا خارجی رخ ہوتے ہیں اور مظاہر عضوی ان کی اندرونی زندگی سے عبارت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ماہر عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ علم الحیات کے مسائل پر وسیع نظر رکھتا ہو۔ مگر اس میں بھی غلو سے پرہیز کرنا چاہئے۔ عمرانیات جیسے علم کو یہ بات کبھی گوارا نہیں ہوسکتی کہ وہ علم الحیات کے ضمیمہ کی حیثیت اختیار کرلے۔ اس لئے کہ اول تو خود علم الحیات کا بنیادی تصور علم کائنات کی طرح نہایت

---

[1] یہ بات قابل لحاظ ہے کہ **Vilfredo Pareto** نے بھی جو طریقۂ ریاضی کو معاشیات میں استعمال کرنے میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، عمرانیات کے مسائل میں اس طریقہ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب "عام عمرانیات کے اصول" اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۱۷ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۹ء میں شایع ہوئی۔

غیر متعین واقع ہوا ہے۔ اگر آپ علم الحیات کی تحقیقات کا غور سے مطالعہ کریں تو آپ ہمارے اس دعوے کی صحت پر صاد کریں گے۔ ایف لے دانتے کی "بیاض علم الحیات" اور سالنامۂ علم الحیات کی جلدوں کے مطالعہ سے جن کی ترتیب اُنہی دیباچ کرتے ہیں، ہم نے یہ رائے قایم کی ہے۔ ان علما کے نزدیک علم الحیات، علم الحیوان، علم نباتات، جراثیمیات اور علم تجربیات سب پر حاوی ہے[1]۔ بلا شبہہ یہ ایک دلچسپ علمی کوشش ہوگی اگر علم الحیات کے تصورات کو محدود کر دیا جائے مگر دقت یہ ہے کہ ان تصورات میں بیشتر ایسے ہیں جو اس قسم کی حد بندی میں نہیں آسکتے بمثال کے طور پر ہم مسئلۂ تعلق جنسی کو پیش کر سکتے ہیں[2] اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اس مسئلہ کو علم الحیات کے بنیادی تصورات میں سے سمجھنا چاہئے۔ ہمارا علم اب تک اس حقیقت کا کھوج لگانے سے قاصر رہا ہے کہ تعلق جنسی کن اثرات کے تحت تعین پذیر ہوتا ہے اور نہ ہم اب تک یہ جانتے ہیں کہ جانداروں کی تفریق جنسی کے کیا اسباب ہیں۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ خود علم الحیات کے تصورات غیر متعین ہیں اور یہ علم خود بالکل ابتدائی حالت میں ہے اس لئے اس کی تحقیق عمرانیات کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ لمارک اور ڈارون، اوران کے دوسرے معصروں نے جو اصول علم الحیات کے پیش کئے تھے ان سے عمرانیات بھی اتنی ہی مستفید ہو سکتی ہے جتنا کہ علوم فطرتی۔ یہ دونوں حکیم تطابق، توارث اور انتخاب کو

---

[1] سالنامۂ علم الحیات کی بحثوں کے عنوان یہ ہیں:۔ خلیہ، عمل پیدائش؛ جنین میں اتفاقی حیات؛ ربط اعضا و وظائف، تفریق جنس؛ موت؛ زندگی کے عناصر کیمیاوی اور اس کی ساخت؛ عام عضویات؛ توارث؛ ابتدائے نوع اور اس کی خصوصیات؛ جانداروں کی جغرافی تقسیم؛ نظام اعصابی اور وظائف ذہنی۔

[2] ملاحظہ ہو موسیو کولیری پروفیسر علم الحیوان جامعۂ سار بون، کی کتاب "تعلقات جنسی کے مسائل" اور ہماری تصنیف "فرانسیسی قوم میں بچوں کی پیدائش اور تعلق جنسی"۔

باب ۱۶

زندگی کے قدیم ترین اصول سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اجتماعی عضویات کے نظریہ کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ چاہے اس سے کسی کو اختلاف ہو کہ معاشرہ بمنزلہ عضو کے ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ مختلف عضووں کا مجموعہ ہے۔ اور وہ قوانین حیات جو آخر الذکر پر اپنا اثر رکھتے ہیں معاشرہ کے لئے بھی موثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ عالم عمرانیات کا یہ فرض ہے کہ وہ ان قوانین سے چشم پوشی نہ کرے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ علوم اجسام نامیہ پر پورا تبحر رکھتا ہو۔

جس طرح عالم عمرانیات کے واسطے علم الحیات کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں، اسی طرح عالم احیاتیات کو بھی عمرانیات کی تحقیق سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں علوم کے ڈانڈے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بیشتر اس کے کہ عمرانیات اور علم الحیات وجود میں آئیں معاشیات نے، جو اس زمانے میں علوم عمرانی کی رہبری کر رہی تھی، مشہور نیچرلسٹ کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ ہنری ملن ایڈورڈ نے اپنی کتاب "بیاض عضویات" میں انسانی اعضا کے وظائف کو واضح کرنے کی غرض سے "محنت کی عضویاتی تقسیم" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح دراصل علم المعیشت کی اصطلاح "اصول تقسیم کار" کے نہج پر وضع کی گئی تھی۔ خود چارلس ڈارون اپنی کتاب "اصل الانواع"[1] میں جس جگہ کشمکش حیات اور بقائے اصلح کی نسبت بحث کرتا ہے وہاں صاف صاف کہتا ہے کہ اس کا نظام خیال دراصل "مالتھس کے قانون کی تعمیم ہے جسے عالم نامی پر چسپاں کیا گیا ہے"۔ چنانچہ ہمارے ہمعصر ماہر علم تشریح نے خون کے کارکن خلیوں کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ عجیب و غریب مظاہر حیات جسم کے لئے بمنزلہ پولیس ہوتے ہیں۔ جسم انھیں اپنے اندرونی مفسدوں کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ اس سے آپ پر یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ کیونکر اعلیٰ علوم ادنیٰ درجہ کے علوم سے

[1] "اصل الانواع"۔ باب ۳۔

باب ۱۲

استفادہ کرتے ہیں[1] اور ساتھ ہی ان کی رہبری بھی کرتے ہیں۔ بقول تارد یہ علوم آپس میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ نقل یک طرفہ ہوتی ہے پھر باہمدگر اثر و تاثر شروع ہو جاتا ہے[2]

---

[1] ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عمرانیات علم الحیات کے مقابلہ میں اعلیٰ رتبہ رکھتی ہے یا زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ عمرانیات کے موضوعوں کا تعلق علم الحیات کے مقابلہ میں ایسے وجودوں سے ہے جو زیادہ پیچیدہ ہیں۔ دراصل سب سے پہلے اس خیال کو آگسٹ کونت نے پیش کیا تھا۔ ہم نے یہاں اس کے خیال کو تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "ارتقائے اجتماعی کے حیاتیاتی اصول"

سترھواں باب

عمرانیات کا تعلق نفسیات کیساتھ

آگست کونت نے علوم کی جو تقسیم ان کے رتبوں کے لحاظ سے کی ہے اس میں نفسیات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ ذہنی انتخابیت نے اس کی طبیعت میں ایک ایسا رنگ پیدا کر دیا تھا کہ اسے نفسیات سے کوئی لگاؤ باقی نہ رہا۔ اپنے خیال کے مطابق اس نے نفسیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ علم الحیات میں ضم ہو جاتا ہے یعنی دماغی عضویات اور دوسرا حصہ عمرانیات کے تحت آجاتا ہے۔

لیکن موجودہ زمانے کے محقق جو ہر حقیقت کو ثبوتیت کے معیار پر جانچنے کے خوگر ہیں، نفسیات کو ایک علٰحدہ خود مختار علم تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے اسے علم الحیات اور عمرانیات کے بین بین رکھا ہے۔ یہ مسئلہ ابھی زیر بحث ہے کہ نفسیات کا واقعی عمرانیات کیساتھ کیا تعلق ہے؟ مختلف قسم کے خیالات اس کی نسبت ظاہر کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں "اجتماعی نفسیات" اور "انفرادی نفسیات" کی اصطلاحوں نے اور بھی خلط بحث پیدا کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں میں سے ایک کی بھی اطمینان بخش تعریف نہیں پیش کی گئی۔ بلاشبہ ان دونوں اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر ہے بشرطیکہ مروجہ معنوں سے علٰحدہ ان کے دوسرے معنی متعین کئے جائیں۔ چنانچہ ذیل کی سطروں میں ہم اس خیال کو واضح

طور پر بحث کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک نفسیات کی تحقیق کا تعلق تین ایسے مظاہر سے ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے اپنی وسعت اور اپنے معنی کی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں [1]

بنی نوع انسان کی ایک مشترک نفسیات وہ ہوتی ہے جس میں ان قابلیتوں کی نسبت تصریح کی جائے جو دنیا کے تمام انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ فرانس کے مدارس وسطانیہ میں عام طور پر اسی نفسیات کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کو آجکل عام طور پر "نفسیات انفرادی" کہتے ہیں۔ اسے "نفسیات اجتماعی" سے مختلف بتلایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اصطلاح ناقص ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی تحقیق انفرادی نوعیت نہیں رکھتی اسے فرد واحد کی ذہنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ان خصوصیات سے بحث کرتی ہے۔ جو تمام انسانوں میں یکساں طور پر مشترک پائی جاتی ہیں۔ یہ زیادہ موزوں ہوگا اگر ہم اسے "نفسیات عام" یا "نفسیات انسانی" سے تعبیر کریں۔

علاوہ بریں بعض محقق یہ کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے کسی خاص عنصر کو علٰحدہ کر کے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسے کسی خاص قوم، شہر، پیشے، طبقہ یا انجمن کے متعلق جداگانہ تحقیق کی جائے۔ یہ عناصر افراد پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان افراد میں بیک وقت ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو بلا استثنا بنی نوع کا مشترک سرمایہ ہیں اور اس کے ساتھ ایسی خصوصیات بھی ملتی ہیں جو محض اس گروہ کے افراد کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات سے نفسیات انسانی بحث کرتی ہے اور دوسری قسم کی خصوصیات کی تحقیق "نفسیات اجتماعی [2]" کو کرنا چاہئے۔ یہ اصطلاح اب عام طور پر رائج ہوگئی ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر یہ اصطلاح پسند نہیں ہے لیکن چونکہ عام

---

[1] ہم نے سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں "علوم اخلاقی و سیاسی کی اکیڈمی" کی روبرو اس کی نسبت اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کیا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "نفسیات عمرانی اور نفسیات انفرادی" تھا۔

[2] Collective Psychology

طور پر اسے مقبولیت حاصل ہوچکی ہے اور بعض دلچسپ تحقیقات اس نام سے موسوم ہوچکی ہیں اس لیئے ہم بھی یہاں اس کو استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق کی بہترین مثال ٹین کی "تاریخ ادب انگریزی" میں ملتی ہے۔

ہر گروہ کے فرد کی ذہنیت میں فرق ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ جو فرد اور تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہیں آپ کو پہلو بہ پہلو ایسے خصائص بھی نظر آئیں گے۔ جو فرد کو کسی خاص گروہ کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور جو اس کی ذات کے لیئے مختص ہوتے ہیں۔ ان خصائص سے ہماری مراد فرد کی ذاتی سیرت کے وہ خد و خال ہیں جو اس کے اور دوسروں کے درمیان مابہ الامتیاز ہوتے ہیں چنانچہ اشخاص کی سوانح حیات میں ان خصائص کو اجاگر کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فرد کی خصوصیات علٰحدہ علٰحدہ دوسرے افراد میں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی مجموعی کیفیت ہر فرد کی ذات سے مخصوص ہوتی ہے۔ وہ صرف اس کی شخصیت میں ملتی ہے اور اس کی ذات کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ اس کی بدولت اس کا وجود دوسرے افراد سے علٰحدہ تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں صفات کی تحقیق نفسیات انفرادی کا کام ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے خیال میں نفسیات کی تین تقسیمیں ہونی چاہئیں "نفسیات انسانی یا عام نفسیات"، نفسیات اجتماعی یا گروہوں کی نفسیات، اور نفسیات انفرادی یا مختلف شخصیتوں کی نفسیات۔ ہم نے اس تقسیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی وسعت کم ہوتی جائے اور مفہوم کے تعین میں اضافہ ہوتا جائے۔ اگر ہم صرف عام نفسیات سے بحث کریں تو لازمی طور پر اسکے یہ معنی ہوں گے کہ ہم اپنی تحقیق کو مجرد کلیات سے آگے بڑھانا نہیں چاہتے[1]۔ مختلف گروہوں کے خصائص کی تحقیق میں پھر بھی کچھ بات ہے۔ اس میں محسوسات کے پیچیدہ مسائل سے مقابلہ

---

[1] اس وقت ہمارے برطانیہ مدارس کی تعلیم میں عام طور پر صرف ان انسانی صلاحیتوں کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جو ہمارے ملک اور ہمارے زمانہ کے سب سے زیادہ مہذب لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام نفسیات کو نظر انداز کر کے آخر الذکر دونوں قسم کی نفسیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

زیادہ بحث ہوتی ہے۔ اس تحقیق کی آخری منزل یہ ہوگی کہ انفرادی اختلافات کا جائزہ لیا جائے۔

مسائل بالا کو پیش نظر رکھنے سے عمرانیات اور نفسیات کی تینوں نوعیتوں کا تعلق آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ عام نفسیات کا علم الحیات کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ دراصل نفسیات عام کا عمرانیات سے بہت دور کا رشتہ ہے۔ برخلاف اس کے نفسیات اجتماعی میں معاشرہ کا تصور ہر وقت موجود رہتا ہے۔ نفسیات اجتماعی کا تمامتر مواد عمرانیات کے حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ کسی قوم کی ذہنیت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ آپ اس کی آبادی، نسلی خصوصیات، معاشی اور خانگی زندگی، قانون اور سیاست وغیرہ کے متعلق علم نہ رکھتے ہوں۔ ان کے جانے بغیر کسی گروہ کی بناوٹ آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر آپ کسی قوم کی ذہنیت سے واقف ہوں تو ایسی حالت میں اس کے مختلف شعبہ ہائے حیات کو سمجھنے میں آپ کو سہولت ہوگی۔ اگر کوئی انفرادی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اجتماعی تنظیم سے واقفیت حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس واسطے کہ انفرادی ذہنیت مختلف عناصر عمرانی سے ترکیب پاتی ہے۔ ہم علوم کی منطقیانہ تقسیم کے اعتبار سے عام نفسیات کو عمرانیات اور علم الحیات کے بین بین جگہ دے سکتے ہیں۔ نفسیات اجتماعی کو عمرانیات کے ہم رتبہ سمجھنا چاہئے۔ نفسیات انفرادی کا رتبہ عمرانیات سے نیچے درجہ پر ہوگا۔ اگست کونت کے نظریئے سے بھی ہم اگر بعد کی تحقیقات سے تکمیل و استفادہ کرلیں، انھیں نتائج کی جانب رہبری ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی نوعیت متعین کرنے کے بعد ہم ان خیالات کا اچھی طرح سے جائزہ لے سکتے ہیں جو عمرانیات اور نفسیات کے تعلق کی نسبت پیش کئے گئے ہیں۔ تارد کا خیال تھا کہ عمرانیات دراصل نفسیات کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک عمرانیات اس وقت وجود میں آئی جب نفسیات کے دائرۂ تحقیق کو وسیع کردیا گیا۔ اس کی حیثیت نفسیات کے ایک شاخسانے سے زیادہ نہیں۔ درکیم کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عمرانیات میں یہ صلاحیت ودیعت ہے کہ وہ نفسیات سے علحدہ ایک علم

کی شان اختیار کرلے اور عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ ایسا کرے۔ عمرانیات "انفرادی نفسیات" سے علیحدہ چیز ہے۔ درکیم نے انفرادی نفسیات سے اس کے معمولی اور منطقی معنی دونوں مراد لئے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ دراصل نفسیات عمرانیات کی مدد کی حاجت مند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کی پیچیدگی اور اس کا الجھاؤ ان نظریوں کی پرفریب سادگی سے نہیں سلجھ سکتا۔ ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں مطلق پس وپیش نہ کرنا چاہیئے کہ عمرانیات کو عام یا انسانی نفسیات کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ بغیر اس کے ہم کسی اجتماعی ادارہ کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم اس جماعت کے انسانوں کی ذہنی ساخت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ عمرانیات نفسیات اجتماعی کی مدد کی بھی محتاج ہے۔ اس لئے کہ کسی خاص جماعت کی سیرت اس وقت تک ہمارے فہم وادارک سے باہر رہے گی جب تک کہ ہم اس کے ارکان کے ذہنی میلانوں سے کماحقہ واقف نہ ہو لیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ عمرانیات کو نفسیات انفرادی سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی باک نہ ہونا چاہیئے۔ عالم عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ اس فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی واقعہ کی نسبت کھوج لگائے جس کی زبردست شخصیت نے معاشروں اور انسانیت کے مقاصد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ غرضکہ نفسیات کی تینوں اقسام عمرانیات کی تحقیق کے لئے جیسا کہ ہم ابھی تفصیل سے بتلا چکے ہیں، نہایت مفید اور اہم ہیں۔

اس کے ساتھ ہمارا دعویٰ یہ بھی ہے کہ عمرانیات نفسیات کی مذکورۂ بالا تینوں قسموں کے لئے مفید خدمت انجام دے سکتی ہے۔ ہم یہ ثابت کرچکے ہیں کہ انفرادی نفسیات کا علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اجتماعی زندگی سے مواد نہ حاصل کرے۔ دراصل نفسیات اجتماعی اور عمرانیات کی ترتیب ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور وہ بے دریغ آپس میں ایک دوسرے سے استفادہ کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ عام نفسیات بھی عمرانیات کے نتائج کو استعمال کرتی ہے۔ یہ ایک امر مسلم ہے کہ انسانوں کی اعلیٰ مشترک ذہنی قابلیتیں اجتماعی زندگی کے توسط سے اگر پیدا نہیں ہوتیں تو اس کی بدولت تکمیل پذیر ضرور ہوتی ہیں۔ موسیو ازولے نے اس باب میں

(باب۱) کیا خوب کہا ہے کہ "عقل شہر کی بیٹی ہے"۔[1] اس مقولہ کو قبول عام نصیب ہوا حالانکہ موسیو ازوالے نے اس کے ثبوت میں جو دلائل و براہین پیش کئے ہیں وہ بہت زیادہ تسکین بخش نہیں ہیں۔ درکیم نے بعد میں اسی خیال کو اپنے رنگ میں پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ فرد کی بعض صلاحیتیں صرف اجتماعی زندگی کی بدولت پھل پھول سکتی ہیں۔ چنانچہ درکیم کہتا ہے کہ انسان نے پہلے پہل تبویب جماعتی زندگی سے سیکھی۔ قدیم انسان معاشرہ کے افراد کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے اس تصور کو سب ذی روح مخلوق پر عاید کیا گیا۔ پھر حیوانات، نباتات اور جمادات کی تقسیمیں ہوئیں۔ انواع کی تقسیم کا تصور اجتماعی زندگی کا رہین منت ہے۔[2] موسیو لیوی بردل بھی ان خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ابتدائی انسان اپنے قبائل اور ذی روح انواع کے مابین ایک قسم کا رشتہ قایم کیا کرتے تھے چنانچہ توتمیت (Totemism) کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ وحشی لوگ مختلف ذی روح ہستیوں کے درمیان جو امتیازی حد فاصل قایم کرتے ہیں وہ عموماً بہت دھندلی ہوتی ہے۔ ان کا خیال دراصل یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی سب ذی روح ہستیاں آپس میں ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہوتی ہیں۔ موسیو لیوی بردل نے ان شہادتوں کی بناء پر "قانون شرکت" وضع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابتدائی انسان کی ذہنیت پر اس قانون کا بہت بڑا اثر تھا۔ آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ مذکورۂ صدر مصنفین کی کوششیں ہمارے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ ابتدائی انسان کی ترقی کے متعلق ہمیں جہاں کہیں سے

---

[1] موصوف کی کتاب "جدید شہر"۔

[2] دیکھو درکیم کی کتابیں "مذہبی زندگی کی ابتدائی شکلیں" اور "آسٹریلیا کی توتمی تنظیمیں"۔ آخر الذکر کے تیسرے باب میں "توتم کے نظام کائنات اور تصور نوع کے متعلق بحث کی ہے۔ نیز دیکھو درکیم اور موس کا مضمون "تبویب و تقسیم کی بعض ابتدائی شکلیں"۔ جو سالنامہ عمرانیات کی چھٹی جلد میں شایع ہوا ہے۔ دونوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سب سے پہلے تقسیم مکان کا تصور قبیلہ کی تقسیموں سے پیدا ہوا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے قبل موسیو ہنری برگون نے بھی تصور مکان اور وجود اجتماعی کے درمیان تعلق بتلایا ہے۔ ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب "نفس بشری کے حقائق بدیہی"۔

بھی مواد ملا اسے ہم نے یہاں پیش کر دیا۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی ذہنی ترقی زیادہ تر (باب ۱)
اس کی اس جد وجہد کا نتیجہ ہے جو اسے حیات اجتماعی کے مسائل سے دوچار ہوتے
وقت کرنا پڑی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس جد وجہد کی بدولت انسان میں خاص
قابلیتیں پیدا ہوئیں یا یہ کہ وہ پہلے سے اس میں ودیعت تھیں اور سعی وجہد کی
بدولت وہ ابھر آئیں؟ یہ مسئلہ ہنوز محتاج تشریح ہے۔ ہمارے خیال میں درکیم کے نظریہ
کو مشکل ہی سے قبولیت حاصل ہو گی۔ اس کے نظریہ پر یہ ایک اعتراض عاید ہوتا ہے
کہ انسان کی بعض نفسی قابلیتیں ودیعتی ہوتی ہیں جنھیں وہ حیات اجتماعی سے نہیں حاصل
کرتا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ ان قابلیتوں کا تعلق حیات اجتماعی سے اتنا
نہیں جتنا کہ حیوانی ارتقاء سے ہے۔ یہ اعتراض علم الحیات کے حقوق کی حفاظت کے
سلسلہ میں کیا جائے گا اور پہلا اعتراض نفسیات کے علمبرداروں کی جانب سے اٹھایا
جائے گا۔ غرضکہ یہ بحث کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی نسبت قطعی فیصلہ
اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ قبل از تاریخ کے انسان اور ابتدائی انسان کی نسبت
ہماری علمی تحقیقات مکمل نہ ہو جائیں۔[1]

بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ عمرانیات اور نفسیات دونوں ایک دوسرے کی ہر منزل پر
مدد کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ان دونوں علوم کے درمیان خواہی نخواہی مخالفت پیدا ہونا بے جا بات
ہے۔ دراصل دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ باہم گرحسن سلوک اور برادرانہ اتحاد سے پیش آئیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو لیوی برول کی کتاب "ادنیٰ درجے کے معاشروں کے ذہنی اعمال" سنہ ۱۹۱۰ء۔ اور "ابتدائی انسان
کی ذہنیت" سنہ ۱۹۲۰ء

اٹھارھواں باب

عمرانیات کا دوسرے علوم اجتماعی کیساتھ کیا تعلق ہے؟

اس باب میں ہم اس کی توضیح کریں گے کہ عمرانیات کا دوسرے علوم اجتماعی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ہم اس کتاب کے شروع میں کہہ آئے ہیں کہ عمرانیات درحقیقت علوم اجتماعی کے فلسفہ سے عبارت ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو ہم نے پھر اس لئے چھیڑا ہے تاکہ ان مسائل کی نسبت ہم کلیات قایم کرسکیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان سے بھی ہمیں بہت کچھ مدد ملے گی۔

نفسیات کے مثل مخصوص علوم اجتماعی سے بھی عمرانیات بہت کچھ استفادہ کرسکتی ہے اور انھیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ عمرانیات ان سب علوم کے مجموعہ کا نام ہے۔ چنانچہ عمرانیات اپنے سارے عناصر انھیں علوم سے فراہم کرتی ہے۔ وہ اپنے وجود کے لئے انھیں کی رہین منت ہے۔ جو تعلق عمرانیات کا ان علوم کے ساتھ ہے اس سے زیادہ گہرا تعلق ہونا دشوار ہے۔

لیکن یہ تعلق دوطرفہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ عمرانیات ان علوم پر مبنی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ ان سبھوں پر حاوی بھی ہے۔ وہ ان کی بنیاد بھی ہے اور ان کی عمارت کا بلند ترین حصہ بھی۔ عمرانیات کو مثل اس نقطہ کے سمجھئے۔ جہاں سے یہ سب علوم مختلف اطراف میں اپنا دور شروع کرتے ہیں اور پھر بالآخر اسی نقطہ پر سب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم

ان خدمات کی طرف اشارہ کریں گے جو عمرانیات نے ان علوم کی کی ہیں۔

سب سے اول تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عمرانیات ان مختلف اجتماعی علوم کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہے۔ چنانچہ یہ عمرانیات کا فرض ہے کہ وہ اس نصاب کو متعین کرے جس کے مطابق ان علوم میں سے ہر ایک کو اپنی تحقیق کے راستہ پر گامزن ہونا ہے نیز یہ بتلائے کہ حیات اجتماعی کی چھان بین میں کس حد تک ان میں اشتراک عمل ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عمرانیات ان علوم کے مقاصد کی تحدید کرے اور ان طریقہ ہائے تحقیق کی داغ بیل ڈالے۔ یہ کام حسب ذیل طریقہ پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

ایک حیثیت سے علوم اجتماعی کے مقاصد علوم اجسام نامیہ کے مقاصد سے بالکل متوازی ہوتے ہیں ہم اپنے مفہوم کی توضیح کے لئے اس تحقیق کو پیش کرسکتے ہیں جو جانداروں کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس تحقیق کے دو طریقے ہیں مختلف انواع کی ساخت کی خصوصیات اور ان کے وظایف کی باری باری سے جانچ پڑتال کرکے یا مختلف انواع کی بہ حیثیت مجموعی تحقیق کرکے ہم اپنے نتایج نکال سکتے ہیں پہلی صورت میں ہماری تحقیق کا نام علم مواليد ہوگا۔ اس میں علم الحیوان اور علم الحیات دونوں شامل ہیں۔ دوسری صورت میں ہمارے مطالعہ کا تعلق تقابلی علم تشریح اور تقابلی علم الاعضا سے ہوگا۔ تحقیق کے دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ پر کارآمد ہیں۔ دونوں طریقوں کا مقصد حقیقت کا کھوج لگانا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں یقیناً علم کی خدمت اسی میں ہے کہ تحقیق کے یہ دونوں طریقے دوش بدوش مروج رہیں۔

مختلف معاشروں کی بھی یہی نوعیت تصور کرنی چاہئے۔ پہلے آپ ان معاشروں کے متعلق چھان بین کیجئے جن کے خصایص میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مخصوص گروہوں کے مختلف اجتماعی عناصر اور حقایق عمرانی پر نظر ڈالئے۔ پہلی قسم کی تحقیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے علم مواليد سے ملتی جلتی ہے۔ اسے ہم تاریخ انسانی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس میں اقوام اور مخصوص گروہوں کی تاریخ سے بحث کی جائے گی۔ مختصراً صرف لفظ تاریخ ہم اس کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ ہماری دوسری تحقیق مختلف اجتماعی علوم کا مجموعہ ہوگی۔ باہمی مقابلہ سے یہ علوم اپنی حدود مقرر کرلیتے ہیں اور یہ متعین کرلیتے ہیں کہ معاشرے کے کن کن عناصر اور کن کن حقایق عمرانی

کو اپنی بحث و نظر کے دائرہ میں رکھیں۔ ہم پچھلے اوراق میں ان علوم کی نسبت ذکر کر آئے ہیں یہ یہاں ہم ان علوم کی فہرست دیتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ عمرانی ساخت سے بحث کریں وہ یہ ہیں:۔

اجتماعی یا انسانی جغرافیہ:۔ اس کا موضوع کائنات فطرت اور انسانی معاشرہ کے باہمی تعلق کو متعین کرنا ہے۔

علم اعداد و شمار اجتماعی:۔ اس علم میں انسانی آبادی، اس کی تبویب اور ان مظاہر سے بحث کیجاتی ہے جن کا آبادی کے گھٹنے بڑھنے پر اثر پڑتا ہے۔

علم النسل:۔ یہ علم مختلف نسلوں کے متعلق بحث کرتا ہے۔

علم ساخت عمرانی:۔ اس علم میں مختلف انسانی گروہ بندیوں سے بحث کیجاتی ہے، جیسے اقوام، پیشے، طبقے، اور انجمنیں۔

اس کے علاوہ وہ علوم ہیں، جو مظاہر عمرانی کی تحقیق کرتے ہیں، جیسے معاشیات علم روایات (خاندانی مظاہر کی تحقیق اس کی شاخ ہے)، علم مذہب، تاریخ علوم، تاریخ ادب، تاریخ فنون، فقہ یا تاریخ قانون، علم سیاست۔

ہمارے نزدیک علوم اجتماعی کا نقشہ مذکورہ صدر خدوخال کیساتھ مکمل ہو سکتا ہے۔

چونکہ عمرانیات کا شمار ان مذکورۂ بالا علوم کی فہرست سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ ان کی نسبت پوری غیر جانبداری کے ساتھ رائے دے سکتی ہے۔ وہ ان سب علوم کے مجموعے پر حاوی ہے۔ اگر ان علوم میں کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو تو یہ عمرانیات کا منصب ہے کہ اسے طے کرے، ان کے حدود متعین کرے اور ان کے طریقہ ہائے تحقیق کی توضیح کرے۔ یہ محض عمرانیات کی تگ و دو اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اجتماعی علوم، فنون کے زمرے میں نہیں شامل کیے جا سکتے اور یہ کہ ان علوم کا مقصد انسانی عمل نہیں ہے بلکہ محض علم حاصل کرنا۔ عمرانیات ان علوم کو طریقۂ استدلال کی گمراہیوں سے محفوظ رکھتی ہے، اور انھیں مجبور کرتی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو مشاہدہ اور استقرار کی کسوٹی پر کسیں۔ اور انتہائی جزرسی اور احتیاط برتیں۔ اس مسئلہ کے متعلق ہم اس کتاب کے دسویں باب میں بھی ذکر کر چکے ہیں کہ عمرانیات ان علوم کے طریقۂ تحقیق اور ان کے مقصد کو متعین کرنے کے لیے خود انھیں کی تحقیق کے نتائج استعمال کرتی ہے۔ دراصل ان علوم میں سے کسی ایک میں بھی اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے رعب اور رکھ رکھاؤ کیساتھ اس فرض کو کماحقہ انجام دے سکیں اسکی وجہ سوائے اس کے یہ کچھ

(باب ۱۵)

نہیں کہ عمرانیات کا حلقہ ان علوم کے حلقے سے زیادہ وسیع ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کا حلقہ ان سبھوں کے حلقے پر حاوی ہے۔ عمرانیات ان علوم کو خود انھیں کے نتائج سے جانچتی ہے اور ان طریقہ ہائے تحقیق پر تنقیدی نظر ڈالتی ہے جن کی بدولت انھوں نے یہ نتائج قایم کئے جو طریقے اسے مناسب معلوم ہوتے ہیں انھیں وہ اپنی ترکیب میں جگہ دیتی ہے۔ یہ دراصل ایک انداز ہے جس کا مطلب دوسرے محققین کو دعوت عمل دینا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بھی اسی طرح کریں۔

اب ہم دوسرے نقطۂ نظر کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عمرانیات سے صرف علوم اجتماعی کی سرحد ہی شروع نہیں ہوتی بلکہ ان کی منزل بھی اسی پر آکر ختم ہوتی ہے۔ ہم نے علوم کے طریقۂ تحقیق کی بحث میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ ہر علم اس کا دعویدار ہے کہ اپنی تحقیق شروع کرنے سے قبل وہ اپنا طریقۂ تحقیق متعین کر لیتا ہے لیکن آپ اکثر دیکھیں گے کہ جب تحقیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے اس وقت طریقۂ تحقیق متعین ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی خصوصی علوم اجتماعی کے موضوع کے متعلق غور و فکر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے ابھی جو کہا وہ اصلیت پر مبنی ہے۔ جن کلیات پر یہ علوم مبنی ہوتے ہیں اور جن نتائج کو وہ مترتب کرتے ہیں، اُن سب پر عمرانیات حاوی ہوتی ہے۔ عمرانیات ان کلیات و نتائج کو ان علوم سے لے کر ان میں امتزاج پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور نازک کام ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ کام نہایت مفید ہے۔ کسی مفکر کے لئے شاید اس سے زیادہ آزمائش میں ڈالنے والا کام اور کوئی نہ ہوگا کہ اس سے فرمائش کی جائے کہ وہ انسانی ارتقاء کے اہم ترین پہلوؤں کو چند مختصر جملوں میں بیان کر دے۔ ہم پندرھویں باب میں دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی کوششیں کس حد تک کامیاب رہیں۔ وہاں ہم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کوششوں میں سے کوئی ایک بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی لیکن یہ کہ اس کوشش کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا۔ جو چاہے اس میں داخل ہو سکتا ہے۔ جس دن یہ کوشش کامیاب ہو گئی اس روز ہم از سر نو عمرانیات کی ان خدمات پر تبصرہ کریں گے جو اس نے علوم اجتماعی کی کی ہیں۔ اُس وقت یہ ممکن ہوگا کہ

باب ۱۵

عمرانیات ان علوم کی تحقیقات کو مختصر ضابطوں کی شکل میں پیش کرے جنھیں ہر شخص بآسانی ذہن نشین کر سکے گا۔ اس طریقہ پر عمرانیات کو یہ منصب حاصل ہو جائے گا کہ ان علوم کے حقایق کی تصدیق کرے۔ ظاہر ہے کہ کسی علم کے لئے اس سے بڑھکر باعث فخر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ اور کسی محقق کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا حوصلہ ہو سکتا ہے کہ اس کی کدو کاوش کی بدولت حقیقت کا ایک جزبے نقاب ہو جس سے ہر کس و ناکس کو فائدہ پہنچے۔

انیسواں باب

عمرانیات اور اجتماعی فنون کا تعلق۔

ہم نے کہیں دوسری جگہ اجتماعی فنون کی یہ تعریف کی ہے کہ ان سے نظری ضوابط مراد لئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کی حالت سدھاری جائے۔ یہ علوم کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم اور فن کا فرق ابھی تک لوگوں نے اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے بالعموم اخلاقیات اور علم سیاست کو فنی علوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا واقعی اجتماعی فنون اور اجتماعی علوم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس جگہ ہم اس امر کی چھان بین کرتے ہیں کہ عمرانیات اور اجتماعی فنون کے درمیان جو تعلق پایا جاتا ہے۔ اس کی قیاسی طور پر کیا تعبیر کی جائے۔ ہمارے خیال میں عمرانیات اور اجتماعی فنون میں جو تعلق ہے اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ عمرانیات ان علوم سے بعض چیزیں مستعار لیتی ہے اور بعض چیزیں انھیں مستعار دیتی ہے۔ ہماری رائے میں وہ جو مستعار لیتی ہے اس کی اہمیت اس کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے جو وہ ان علوم کو مستعار دیتی ہے۔ عمرانیات، فنون اجتماعی کی سب سے بڑی خدمت تو یہ کرتی ہے کہ وہ ان کے مقاصد اور ان کے طریقہ ہائے تحقیق کو متعین کر دیتی ہے۔ پھر وہ علم اور فن کے باہمی فرق کی بھی ساتھ ساتھ توضیح

(باب ۱۹) کرتی ہے اور ان دونوں کے بنیادی تصورات کو ٹھیک مقرر کر دیتی ہے۔ عمرانیات کی بدولت فنون اجتماعی کی تحدید عمل میں آتی ہے اور ہر فن کی حدبندی کے ساتھ وہ یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ کونسا فن کس علم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اصولی طور پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہر اجتماعی مقصد کے لئے ایک علم کا ہونا ضروری ہے جو اس کی تحقیق کرے۔ اور ایک فن کا ہونا بھی ضروری ہے جس سے علم کی تکمیل ہو لیکن اس التزام کو مطلق نہ سمجھنا چاہئے۔ یقیناً ہر علم کے جداگانہ وظائف ہیں۔ چنانچہ معاشیات کی تکمیل فن معیشت سے ہوتی ہے۔ علم روایات کے ساتھ اخلاقیات کا ہونا ناگزیر ہے۔ تاریخ ادب و آرٹ یا جمالیات کے ساتھ حسن ذوق کے مختلف ضابطے وابستہ ہیں۔ علم مذہب اور اعتقاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تاریخ قانون کے دوش بدوش عملی قانون کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارا اشارہ اس موقع پر مقنن اور مفتی کے فن کی طرف ہے۔ اسی طرح علم سیاست کے ساتھ عملی سیاست کا ہونا لابدی ہے۔ مگر وہ علوم جن میں اجتماعی ساخت سے بحث ہوتی ہے ان میں علم اور فن کا درمیانی فصل ذرا زیادہ بڑا ہو جاتا ہے چنانچہ علم اعداد و شمار اجتماعی اور علم تولید اصلح (Eugenics) کے درمیان اور اجتماعی علم ساخت اور تمدنیات (Civics) کے درمیان جو تعلق ہے اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔[1] اسی طرح اجتماعی جغرافیہ اور ان تمام فنون کے تعلق کی نوعیت ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کرۂ ارض سے کیونکر زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے علم و فن کے یہ تعلقات اتنے واضح نہیں ہیں جتنے ہونے چاہئیں۔ لیکن اگر آپ متعالیتی علوم اجتماعی کے بجائے بیانی علوم اجتماعی کو لیں، جو دراصل تاریخ اقوام کا دوسرا نام ہے، تو اس صورت میں یہ عدم وضاحت رفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا فن کیسے تلاش کیا جائے

[1] علم تولید اصلح سے وہ علم مراد ہے جو یہ بتائے کہ کس طریقہ سے قوم میں تندرست افراد کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ تمدنیات یہ بتاتی ہے کہ لوگ اچھے شہری کس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ انگریزی سے فرانسیسی میں لئے گئے ہیں۔ آخر الذکر ابھی تک عام طور پر رائج نہیں ہوا ہے۔

جو دنیا کی تمام اقوام کی بہتری کا ضامن ہو۔ اس خصوص میں ہم اس طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذکورۂ بالا اجتماعی فنون میں سے ہر ایک کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ قومی گردوپیش کا لحاظ رکھے جس کی مناسبت سے اس کے اصول وضوابط بھی حسب ضرورت قومی رنگ میں رنگ جانے چاہئیں۔ علم اور فن کے التزام کو اس سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنا بے سود ہے۔ یہ التزام چاہے کتنا ہی ناقص اور غیر مکمل سہی لیکن ہم اپنی تحقیق میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے عمرانیات نے اس التزام کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی توضیح کی۔

عمرانیات ہی نے سب سے پہلے فنون اجتماعی اور علوم اجتماعی کے مختلف طریقہ ہائے تحقیق میں امتیاز کیا۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ فنون کا طریقۂ تحقیق نزولی ہوتا ہے اور علوم کا طریقۂ تحقیق صعودی ہوتا ہے۔ ہم پہلے یہ بتلا چکے ہیں اور پھر اسے یہاں واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اول الذکر بہ مقابلہ آخر الذکر استخراج اور تجربہ کو زیادہ استعمال کرتا ہے[1]

یہاں یہ جتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اجتماعی فنون کے ماہروں کے لئے عمرانیات کی حیثیت تمہیدی مطالعہ کی سی ہے کوئی آدمی کسی اجتماعی فن میں اس وقت تک کمال نہیں حاصل کر سکتا جب تک کہ اسے عمرانیات میں درک نہ ہو بہتر تو یہ ہوگا کہ اسے دوسرے اجتماعی علوم سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو مگر یہ لازمی نہیں۔ ہر شخص سے اتنی توقع رکھنا بے جا ہوگا۔ ہاں ہر ماہر فن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان علوم اجتماعی کے متعلق ایک مجموعی نقطۂ نظر رکھتا ہو۔ اس کے لئے اسے عمرانیات کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا علم نہیں جو تمام اجتماعی علوم کے امتزاج پر حاوی ہو۔ ہم اپنے اس خیال کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ ہمارے ہمعصروں میں ایسے بہت سے موجود ہیں جو مجالس قانون ساز میں، اپنی تصانیف میں یا اخبارات میں اپنے سیاسی نظریوں پر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ شغل در اصل فن سیاست سے متعلق ہے۔ انہیں

---

[1] چودھواں باب۔

[باب ۱۹]

علم سیاست پر پورا عبور حاصل کرنا چاہئیے تاکہ وہ اپنے ملک کے دستور اساسی، تاریخ دستور اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے پبلک اداروں پر غور وخوض کرسکیں۔ اور بھی اچھا ہو اگر وہ علم اعداد وشمار اجتماعی، معاشیات اخلاقیات اور قانون کے مسائل سے دلچسپی پیدا کریں۔ اسی سے ان کی ذات اور انکے ملک دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر اس سے بڑھکر یہ ممکن ہو کہ ہماری قومی قسمتوں کے فیصلہ کرنے والوں کے ذہن میں معاشروں کی زندگی، ان کی ساخت، ان کے وظایف اور ان کے ارتقار کی نسبت ٹھیک تصورات موجود ہوں تو کیا کہنا! اگر عمرانیات کے حقائق سے وہ بصیرت اندوز ہوں تو یقین ہے کہ انکے تمام فیصلے ہمیشہ عقل و دانش پر مبنی ہوں گے۔

اب ہم اجتماعی فنون میں صرف فن اخلاق کے متعلق کچھ عرض کردیں جسے اخلاقیات بھی کہتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اخلاقیات کا عمرانیات کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ایک مبسوط کتاب اس موضوع پر لکھی جاچکی ہے کہ عمرانیات کے وجود سے اخلاقیات کے سارے اصول درہم برہم ہوجائیں گے[1]۔ غالباً قابل مصنف نے عمرانیات سے ڈرکیم کے نظریئے اور اخلاقیات سے سینٹ تھامس کے اصول مراد لئے ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں مفکرین کے خیالات میں مشکل ہی سے کوئی قدر مشترک ملے گی۔ لیکن دراصل یہ تنگ نظری ہے کہ آپ اخلاقیات کو مذہب تھامس تک محدود رکھیں اور عمرانیات کو کسی خاص نظریہ کے تابع قرار دیں۔ ہمارے خیال میں یہ بھی درست نہیں کہ ڈرکیم کے خیالات رسمی اخلاق کے منافی ہیں اور اس دعوے کی تو یقیناً کوئی اصلیت نہیں کہ تمام علمائے عمرانیات رسمی اخلاق کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ عمرانیات سے بڑھکر دنیا کا کوئی علم بھی رسمی اخلاق کا احترام نہیں کرسکتا۔ علمائے عمرانیات تو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق چند انسانوں کی من گھڑت چیز نہیں ہے۔ انسانوں میں غیر معمولی ذہانت والے بھی شامل ہیں اور دھوکے باز بھی۔ لیکن ان دونوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ کسی نظام اخلاق کی بنا ڈال سکیں۔ اخلاق دراصل انسانوں کی

[1] سموں دے پلوارج کی تصنیف "اخلاقیات اور عمرانیات کا تصادم" ۱۹۱۱ء

(باب ۱۹)

اجتماعی زندگی کی اختراع ہے۔ اخلاق نتیجہ ہے ایک مسلسل جدوجہد کا جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسانوں نے کی۔ اخلاق معاشرہ کے منتخب افراد کے تجربہ کا حاصل ہوتا ہے۔ ان افراد کے تجربات و اصول عملی جامہ پہنکر عام ہو جاتے ہیں اور یہی اخلاق کی بنا ہے۔ ان کے یہ تجربات ماضی کا عطر اور مستقبل کے بہترین رہبر ہوتے ہیں۔ کیا ارباب علم میں کوئی ہے جو علمائے عمرانیات کی طرح رسمی اخلاق میں ان خوبیوں کو تسلیم کرتا ہو؟

ہمارے خیال میں اجتماعی فنون سے عمرانیات کو کوئی ایسے فائدے نہیں پہنچے جو قابل ذکر ہوں۔ بلاشبہ کسی خاص اجتماعی حالت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کے پیش نظر وہ سب اصلاحی نظرئیے اور ان کے نتائج موجود ہوں جو اس خاص گوشہ میں رونما ہو چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان معلومات کا حاصل کرنا علم کی بڑی خدمت ہے۔ عالم عمرانیات اس معلومات سے استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن بہترین صورت یہ ہے کہ عالم عمرانیات خود اجتماعی تحریک میں بذات خود شریک ہو۔ اس طرح وہ مظاہر اجتماعی کی جو تاویلیں پیش کرے گا ان میں وثوق اور اعتماد کا عنصر مقابلۃً زیادہ ہوگا۔ لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ عمل اور فن دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ فن نظریہ ہوتا ہے اور عمل اس کی تکمیل۔ بہرحال ہمارے خیال میں عالم عمرانیات کے لئے اس میں کوئی خاص فائدہ متصور نہیں کہ وہ عمل کے لئے نظریہ وضع کرے۔ یہ کام دراصل فن اجتماعی کے سپرد کرنا چاہیئے لیکن اسکے ساتھ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ عالم عمرانیات عملی زندگی کے لئے بہ مقابلہ کسی تخیل پرست کے زیادہ مناسب نظرئیے قایم کرے۔ بہرحال اگر ایسا ہو تو بھی یہ عمرانیات کا احسان ہوگا فن اجتماعی پر نہ کہ اسکے برعکس۔ ہمارے خیال میں آگست کونت کے اصول عمرانیات کو اس کے تنظیمی منصوبوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اسطرح ہربرٹ اسپنسر کے اصول عمرانیات کو ان معاشی تجاویز سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ جو اس نے انفرادیت کی تائید میں نہایت جارحانہ انداز میں پیش کی تھیں۔ غرضکہ جب تک کہ نئی تحقیقات اس امر کو پایۂ ثبوت کو نہ پہنچا دے کہ عمرانیات کو اجتماعی فنون سے مدد مل سکتی ہے اسوقت ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اس قسم کے دعاوی کو شبہ کی نظر سے دیکھیں۔

بیسواں باب

عمرانیات اور فلسفہ کا تعلق۔

اب ہمیں بس یہ بتلانا اور باقی رہ گیا ہے کہ عمرانیات اور فلسفہ کے درمیان جو تعلق ہے۔ اس کی کیا نوعیت ہے۔ یہاں فلسفہ سے ہماری مراد عام فلسفہ ہے۔ جہاں تک کہ نفسیات اور اخلاقیات کا تعلق ہے تو اس کی نسبت ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اکثر اوقات ان دونوں کو فلسفہ کے اجزا سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ہم نے ان کا عمرانیات کے ساتھ علٰحدہ مقابلہ کیا ہے۔

عام فلسفہ کے بھی کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ کم از کم یہ تو ہر کسی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسفہ کے اہم مسائل کو پیش کرنے اور ان کے حل معلوم کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ انمیں سے ہر طریقہ اپنی اپنی جگہ کارآمد ہے اور محقق کا یہ فرض ہے کہ وہ ان سب کی طرف مساوی توجہ کرے۔ ہم اس وقت جس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہتے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کا رنگ ہمارے طریقۂ تحقیق پر بھی غالب آجائے گا۔

فلسفہ کی ایک یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ علوم کے امتزاج کا نام ہے۔ یہ تعریف ابھی جدید زمانہ میں پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ آگسٹ کونت نے اپنے "فلسفۂ ایجابی" کو ہربرٹ اسپنسر نے اپنے "فلسفۂ امتزاجی" کو اسی تعریف پر مبنی ٹھہرایا

(باب ۲، تھا۔ ان دونوں مفکرین نے فلسفہ کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں اور عمرانیات میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ اور اس تعلق کی نوعیت بھی بہت ہی سادہ ہے۔ دراصل اس کے مطابق عمرانیات فلسفہ کی اعلیٰ ترین منزل کا نام ہے۔ ہم فلسفہ کی عمارت کو تین منزلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ فلسفۂ کائنات، فلسفۂ حیات، اور فلسفہ عمرانی۔ آخر الذکر کی حیثیت ان تینوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔ اس طرح فلسفیانہ تحقیق کی آخری کڑی عمرانیات ہوئی۔ بعض لحاظ سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ فلسفہ کا منشا ہی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ عمرانیات کے راستہ میں سے خس و خاشاک کو صاف کرے اور اس کے وجود کو ممکن بنائے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے ابھی جن مفکرین کا نام لیا ہے ان کے ہاں عمرانیات کے باب میں ایک طرح کا غلو پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آگست کونت کا تو یہ عقیدہ تھا کہ علم کی قدر و قیمت کا حقیقی معیار خود انسان ہے۔ بلاشبہ اس اصول کی سچائی میں کلام نہیں لیکن کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ علم کی ساری قدر و قیمت کا معیار وہ استعمال ہے جو اجتماعی زندگی میں مروج ہو۔[1] آگست کونت اس نتیجہ کا قائل تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے ان سب علوم کی تحقیق کو بے سود بتلایا ہے جن سے براہ راست انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ فلکیات اپنے دائرہ تحقیق کو محض مظاہر شمسی تک محدود رکھے اور سیاروں سے متعلق بحث نہ کرے۔ ہمارے خیال میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو اس کے ان دلائل کو سمجھ سکے۔ کائنات فطرت کے دور افتادہ مظاہر کی تحقیق خالص علمی نقطۂ نظر سے وہی حیثیت رکھتی ہے جو انسان سے قریب تر مظاہر کی تحقیق کو حاصل ہے۔ اس سے انسانی ذہن کو تسکین ملتی ہے اور اس کے اعلیٰ ترین مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی بدولت انسانی جوہر پرورش پاتا ہے۔ ہمارے خیال میں کسی محقق کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ یہ تحقیق کبھی بھی انسان کے کام نہیں آئے گی۔ ہمیں مستقبل کا حال

[1] یہاں ہماری مراد علم کے مادی استعمال سے نہیں ہے۔ غالباً آگست کونت خود اس حد تک دعویٰ نہ کرتا۔

(بابِ اول) کیا معلوم سے[1] چنانچہ علم کو علم کی حیثیت سے فروغ دینا لازم ہے نہ اس لئے کہ معاشرہ کو اس سے فوری نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ عمرانیات کے نقطۂ نظر کو آپ ایک اور طریقے سے بھی اعلیٰ و ارفع ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آپ عمرانیات کے تصورات کو علوم اجسام نامیہ و علوم کائناتی میں رائج کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ اعلیٰ تصورات کی تاویل ادنیٰ تصورات سے نہیں کیجا سکتی۔ اسی طرح ہمارے خیال میں یہ ایک بے جا کوشش ہو گی اگر کوئی عالم عمرانی کے حقائق کو طبیعی و کیمیاوی قوانین کے یا حیاتیاتی کلیات کے تابع قرار دے۔ اس کے برعکس کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اعلیٰ تصورات کو ادنیٰ درجے کے تصورات میں تلاش کرے۔ چنانچہ عضوی و کائناتی مسائل کے حل کے لئے عمرانیات کی اصطلاحیں بے سود ہیں۔ اس سے خلط مبحث کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ کہ اس طریقہ سے مسائل پر جو روشنی ڈالی جائے گی وہ جھوٹی روشنی ہو گی۔ چنانچہ عمرانیات نہ خود دخل دے اور نہ کسی دوسرے کے دخل کو گوارا کرے۔ وہ بے جا دخل اندازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اس سے اس کے وقار کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن وہ فلسفیانہ تصورات کو اپنے آغوش میں جگہ دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہے۔

مذکورہ بالا خیال کے مقابلہ میں ایک دوسرا خیال پیش کیا گیا ہے۔ اس خیال کے حامی فلسفہ کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ فلسفہ دراصل علم کے وظائف سے عبارت ہوتا ہے۔ اس مسلک کے پیرو فلسفہ کو بجائے علوم کے پچھلی صف میں رکھنے کے آگے کی صف میں جگہ دیتے ہیں۔ ہم نے فلسفہ، علم اور وظائف کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے

---

[1] ہم میں سے کوئی بھی یقین کیساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں فلاں چیزیں آئندہ انسان کے لئے کارآمد ہونگی۔ خود آگسٹ کونت نے اس ضمن میں ایک واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ یونانی ماہرین اقلیدس نے جو Conic Sections (قطعات مخروطی) کے متعلق خیال آرائیاں کی تھیں ان سے سیاروں کے مدارات کے متعلق حقائق منکشف ہوئے۔ سیاروں کے مشاہدے سے جہازرانی کو مدد ملی۔ چنانچہ وہ خیال آفرینیاں جو شروع شروع میں محض نظری حیثیت رکھتی تھیں بعد میں عملی زندگی میں کس قدر کارآمد ثابت ہوئیں۔

(باب ۲)

ہیں انسانیت سے ان کے مراتب کو ظاہر کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ ہم نے یہاں انھیں منطقی ترتیب سے استعمال کیا ہے۔ مذکورۂ بالا نقطۂ نظر سے فلسفہ دراصل علم کی قیاسی حالتوں کی تنقیح کا نام ہے۔ فلسفہ کے اصول انسانی خیال کی ساخت اور اس کے نشو و نما سے متعلق ہیں۔ یہ نظریہ کانٹ نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ وہ فلسفہ کی یہ تعریف کرتا ہے کہ "فلسفہ علم کی عام تنقید کو کہتے ہیں"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے فلسفہ کی نظر میں عمرانیات کی کیا حیثیت ہوگی؟ ہم یہاں ان سب دشواریوں کا ذکر فضول سمجھتے ہیں جو عمرانیات کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اور اس کی فلسفیانہ تہذیب میں مانع آتی ہیں۔ ہمارے لئے بس اس قدر جاننا کافی ہوگا کہ اور دوسرے علوم کے مثل عمرانیات کے حلقہ عمل کی بھی تحدید ضروری ہے اور اُسے ان حدود کی پابندی لازم ہے جو اس پر عاید کی گئی ہیں۔ دوسرے علوم کی طرح عمرانیات کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے میں لوچ پیدا کرے تاکہ انسانی ذہن میں اس کی سمائی ہو سکے اور احساس و فکر کے قوانین کا اس کے ساتھ ربط قایم ہو۔ خارجی مادہ (اور معاشرہ کو اس کے ایک عنصر کی طرح سمجھنا چاہئے) جس وقت انسانی ذہن میں داخل ہوتا ہے تو اس کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ ہم صرف مظہر کا ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن اس مظہر کے پیچھے جو حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ ہمارے سرحد ادراک سے پرے ہوتی ہے۔ یہی حقیقت اس مظہر کی بنائے وجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اور دوسرے علوم کے مثل عمرانیات بھی مظاہر سے بحث کرتی ہے۔

عمرانیات پر جو اس طرح تنقید کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں علمائے عمرانیات یہ کہتے ہیں کہ ہاں، ہماری تحقیق عام علم کی ترقی کے تابع ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی علم کی عام شرائط کیونکر وجود میں آتی ہیں؟ خود علم کے اندر انسانی ذہن کا عنصر موجود ہوتا ہے اور یہ ذہنی عنصر ہر خارجی شئے پر اپنا نقش جما دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کا تعلق ان اولیات سے نہیں ہے جن کی تشریح محال ہے۔ یہ ذہنی عنصر صد ہا سال کی جد و جہد سے مجتمع ہوا ہے۔ اس میں حیاتیاتی اور عمرانی دونوں موثرات موجود ہیں۔ اسپنسر کا قول ہے کہ عقل کے اصول و ضوابط

اگرچہ آج ہمیں بالکل ہر فرد بشر کے لئے فطری معلوم ہوتے ہیں مگر فی الحقیقت وہ نتیجہ ہیں انسانی ذہن کی اس پیہم جدوجہد کا جو اسے منازل ارتقاء کے طے کرتے وقت کرنا پڑی ۔ ہمارے ہمعصر علمائے عمرانیات اسپنسر کی تائید کرتے ہیں ۔ وہ یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ انسانوں کی ذہنی ساخت بیشتر ان کی اجتماعی زندگی سے ماخوذ ہے ۔ عقل و فکر کی صلاحیتیں نتیجہ ہیں اس توجہ کا جو ابتدائی انسان نے اپنی تنظیم کے لئے کی ۔ سچ یہ ہے کہ اس دعوے کا مکمل ثبوت اب تک نہیں پیش کیا گیا اور اگر فرض کیجئے کہ ثبوت فراہم ہو جائے تب بھی انسانی ذہن کی ساخت کے متعلق ہم تشفی بخش توضیح نہیں کر سکیں گے ۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ اس نظریہ کے بعض نکات نہایت سبق آموز ہیں ۔ اور ہماری تمنا ہے کہ اس مسئلہ پر تحقیق کے سلسلہ کو جاری رکھا جائے ۔ اگر یہ تحقیق جیسا کہ چاہئے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علم کی شرائط میں عنصر اجتماعی کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس کے بعد علم کی تحقیق محض قیاسی نہیں ہوگی بلکہ عمرانیات کی مدد اس کے لئے درکار ہوگی ۔

علاوہ بریں عام فلسفہ کے ضمن میں ایک اور تصور ہماری توجہ کا مستحق ہے ۔ یہ تصور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے ۔ اس کے حامیوں میں حکماء کی بہت بڑی تعداد شامل ہے اور ان میں بعض بہت شہرت رکھتے ہیں یہ فلسفہ کا مابعد الطبیعی تصور ہے ۔ اس تصور کی بدولت جو مختلف مذاہب فلسفہ وجود میں آئے ان میں باوجود ظاہری اختلاف کے یہ خیال مشترک ملے گا کہ ظاہری حقائق سے ماوراء جن پر شہادۃ زمان کی قیود عاید ہوتی ہیں، ایسے حقائق بھی ہیں جو ان قیود سے بالاتر ہیں ۔ یہ حقائق ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ اس تصور سے ہمیں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ مادی قوتوں کے اثر کے علاوہ اخلاقی قوتیں بھی اپنا کوئی وجود رکھتی ہیں ۔ علم ان کی پوری کیفیت نہیں معلوم کر سکتا ۔ صرف نفس انسانی انھیں محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس کی گرفت میں بھی آ سکتی ہیں ۔ انھیں مقدار کے پیمانے میں ناپنا محال ہے ۔ ان کے صرف اوصاف بیان کئے جا سکتے ہیں ۔ ان پر رائے زنی کرنے اور انھیں سمجھنے کا بس یہی ایک

باب ۷

طریقہ ہے۔ مختصر یہ کہ مابعد الطبیعیات فلسفہ علوم کی طرح حسی تجربہ تک محدود نہیں اور نہ تنقید کے اصول وضوابط کی جکڑ بند میں اپنے تئیں پابند کرتی ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں دل ودماغ کی ترنگ سے بھی استفادہ کرتی ہے۔ مابعد الطبیعیات کی بدولت ذہن انسانی نے مظاہر خارجی کی تہ میں ہستی کے راز کو پہچانا۔ اسی کی بدولت انسان کو اضافی، ممکن اور محدود کے ماوراء ذات الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے جو مطلق اور واجب ہے۔

فلسفہ کے اس مابعد الطبیعی تصور کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانا ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ہمیں صرف اس امر کی جستجو ہے کہ عمرانیات کو اس کے روبرو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس خصوص میں پہلے ایک جگہ ہم غلط فہمی کا ازالہ کر چکے ہیں۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مابعد الطبیعیات اور علم (Science) کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ کبھی دور نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ عمرانیات کا شمار علوم کی فہرست میں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بھی مابعد الطبیعیات کے دشمنوں کی صف میں داخل سمجھی جائے گی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض علمائے عمرانیات کا طرز عمل مابعد الطبیعیات کی طرف جارحانہ رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی بتلا دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اب علمائے عمرانیات کا رویہ وہ نہیں ہا جو پہلے تھا۔ در اصل ضرورت اس کی ہے کہ علوم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں۔ ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہے کہ علمائے مابعد الطبیعیات کو اس امر کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ کی طرح آج مابعد الطبیعیات تمام علوم پر قابض ہونا نہیں چاہتی۔ وہ صرف اپنے حلقۂ تحقیق کے گوشوں کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی حدود بس وہیں سے شروع ہو جاتی ہیں جہاں علوم کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ روز بروز علوم صحیحہ کے ساتھ اس کی ہمدردی بڑھتی جا رہی ہے اور روز بروز وہ ان کے نتائج کو استعمال کرنے میں پیش قدمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم اس امر کا بھی یہاں اعادہ کریں کہ مابعد الطبیعیات ایک چوتھائی صدی سے برابر ریاضی، طبیعیات، حیاتیات، اور تجربی اور متقابلی نفسیات کے نتائج کو برابر استعمال کر رہی ہے۔ بظاہر ہمیں یہ شبہ کرنے کی

کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ عمرانیات کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کرے گی۔ ہمیں تو یقین ہے کہ عنقریب وہ حیات اجتماعی کو اپنا سہارا بنائے گی۔ اس لئے کہ کائنات کے تمام مظاہر میں مظاہر عمرانی ہی ایسے ہیں جن کے حقائق سے وہ براہ راست مستفید ہو سکتی ہے۔ اخلاقی قوتوں کی کارفرمائی اگر دیکھنا ہو تو حیات اجتماعی کا مطالعہ کیجئے۔ یہ قوتیں صرف انسانی ذہن اور انسانی دل کی دنیا میں آپ کو موثر نظر آئینگی۔ عمرانیات کا کام یہ ہے کہ ان اخلاقی قوتوں کے اثرات کا جائزہ لے اور مابعد الطبیعات ان قوتوں کی ماہیت سے بحث کرے۔ چنانچہ عمرانیات اس کے سامنے واقعات پیش کرے گی اور وہ ان کی تاویلیں کرے گی۔ اول الذکر کی نظر ظاہر سے آگے نہیں بڑھتی لیکن آخر الذکر حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر مابعد الطبیعیات عمرانیات کا سہارا ڈھونڈھے تو وہ نفع میں رہے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ عنقریب ایسا ہی ہوگا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ علمائے عمرانیات اپنے نتائج کو صحت کے ساتھ متعین کریں اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔

اب آخر میں ہم علمائے عمرانیات کی خدمت میں بعض ضروری باتیں پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ مابعد الطبیعات کو عمرانیات کا ہر طرح لحاظ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ یہ بیان کرتی ہے کہ معاشرہ میں انفرادی وجود، کائنات، فطرت، زندگی اور مقدر کے متعلق کس قسم کے خیالات رائج ہیں۔ وہ ان عام تصورات کی بھی تشریح کرتی ہے جو انفرادی یا اجتماعی چلن پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ کسی قوم کی مابعد الطبیعات سے واقفیت حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اس کی روح کی گہرائیوں کا کھوج لگا لیا۔ مسائل اُخروی کے متعلق لوگوں کے جو اعتقادات ہوتے ہیں ان کا اثر اس خاص ملک اور عہد کی تاریخ پر پڑتا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ فلسفیانہ خیالات کی تاریخ در اصل انسانی ذہن کی تاریخ سے عبارت ہے یا یوں کہئے کہ وہ پوری انسانی زندگی کی تاریخ کا لب لباب ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرانیات جیسے علم کے لئے جو بنی نوع انسان

کے ارتقائی عناصر کا امتزاج پیش کرتی ہے، مابعد الطبیعیات بڑی اہمیت رکھتی ہے محقق عمرانیات کو مابعد الطبیعیات کی تاریخ کے علاوہ اس کے موجودہ عقاید سے بھی دلچسپی رکھنی ضروری ہے اس لئے کہ یہ عقاید حیات اجتماعی میں زبردست محرکات کا کام دیتے ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی بدولت انسانی ذہن عین کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ظاہر کے ادنیٰ جلووں میں پھنس کر نہیں رہ جاتا۔ اسی کی بدولت مادہ اور قوت، زمانہ اور حرکت، جسم اور روح کے حقایق کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور محسوسات کے علاوہ آدمی کی پہنچ وہاں تک ہو جاتی ہے جس کا ادراک صرف انسانی فکر کر سکتی ہے۔ مابعد الطبیعیات سے انسانی عقل کو مجرد، ماورا اور غیر محسوس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ہم اسے تخلیقی قوت کے اس سرچشمہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس کا فیض ہمارے لئے اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کے لئے ہے جو مستقبل میں تہذیب و تمدن کی علمبردار ہوں گی۔

اگر آپ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو عمرانیات اور مابعد الطبیعیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ دونوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ہمارے خیال میں فلسفیانہ تحقیق میں بڑی وسعت و گنجایش ہے بشرطیکہ کام کرنے والوں کی نیتیں ٹھیک ہوں۔

تمت

صحتنامہ

مبادی عمرانیات (ریفے ورم)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳۴	۱۹	خاکسر کے فرانس،	خاکسر فرانس	۴۷	۵	امتیازیات	امتیازات
۳۷	۱۳	اسی جبر کا اثر	اس جبر کا اثر	″	۱۳	اس طرح	اسی طرح
۴۴	۱۶	وجود سے	قدر و قیمت سے	۸۹	۶	تماتناہ	تماشا
۴۶	۲۴	عمر زیادہ سے	عمر زیادہ سے زیادہ	۱۰۴	۲۲	ان کی بنا پر پر	ان کی بنا پر
		زیادہ ہوئی	بہت ہوئی	۱۲۲	۱۱	مماکت	مملکت
۴۹	۲۳	پر لو ہوتے	پر تو ہوتے	″	۲۱	جسہ جستہ	جستہ جستہ
۵۶	۱۳	ان انسانی ارادوں	اور ان انسانی ارادوں نے	۱۲۹	۱۰	بیشتر	پیشتر
		اور مختلف	اور اور مختلف	۱۳۵	۱۷	ذکر چکے	ذکر کر چکے
″	۱۳ و ۱۴	مقامات ہیں	مقامات میں	۱۶۶	۲۱	اُدھروی	اُخروی
۵۷	۸	ہاتھ کے انگلیوں	ہاتھ کی انگلیوں	۱۶۷	۹	اوراء	ماوراء
۶۳	۱۵	ترشح	مترشح	″	۱۲	آنیوالی سلوں	آنیوالی نسلوں

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس عاملہ، مجلس انتظامی، مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۲- اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ اور اراکین دار الترجمہ دس کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۳- طلبا میں جن کے نام رجسٹر شدہ ہوں دو کتابیں بی۔ اے۔ اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ تین کتابیں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی و تحقیقاتی جماعتوں کے طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۴- مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب ایک آنہ یومیہ فی کتاب دیرانہ لیا جائے گا۔

۵- بیش قیمت کتابیں گھر جاری کی جا سکیں گی مگر اس غرض کے لیے کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶- کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو مستعیر پر ذمہ داری عائد ہوگی۔

۷- کتابوں پر کسی قسم کا نشان سیاہی یا پنسل سے نہ لگایا جائے۔

۸- قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط